قیمت: 10/- روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

اکتوبر 2006

استاد بسم اللہ خاں، شہنائی نواز

ولادت: 21 مارچ 1916   وفات: 21 اگست 2005

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	سادہ ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری
پاکستان	184 روپے	172 روپے	316 روپے	256 روپے
نیپال	228 روپے	160 روپے	360 روپے	292 روپے
بنگلہ دیش	174 روپے	146 روپے	306 روپے	238 روپے
دیگر ممالک	220 روپے	160 روپے	396 روپے	336 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، وِنگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

ماہنامہ
اردو دنیا نئی دہلی

جلد-8، شمارہ-10 اکتوبر 2006

مدیر: ڈاکٹر آر. کے. بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر.کے.پورم، نئی دہلی-110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26169416, 26109746

شاخ: 22-7-110، قمر ڈفلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2
ہماری بات 5

روبرو
• وریندر پٹواری سے گفتگو .... فیروز عالم 6

گوشۂ خورشید الاسلام
• خورشید الاسلام کی یاد میں .... شمس الرحمن فاروقی 9
• سوانحی اشارے .... عبدالرب 11
• غزلیں، نظم، قطعات .... خورشید الاسلام 12
• خطوط نگاری .... خورشید الاسلام 14

خراج عقیدت
• شہنائی خاموش ہوگئی .... سید امتیاز الدین 18

زبان اور تعلیم
• ہماری قومی زبان .... عبدالعلیم 20
• اردو زبان اور روزگار کے مواقع .... حبیب الرحمن چغانی 24
• برطانیہ میں اردو .... عبدالباری مسعود 28
• عوامی ذرائع ترسیل اور اردو .... علی اصغر 31
• قدیم مخطوطات و مطبوعات کا تحفظ .... انصار احمد معروفی 33

سائنس اور طب
• ہندوستان میں ریموٹ سنسنگ .... اقبال محی الدین 36
• نینو ٹیکنالوجی .... محمد خلیل 40
• ماحولیاتی توازن اور گدھ .... مانک پانڈے 42
• آشوب چشم قشی .... حکیم اشہر قدیر 44

سماجیات
• میرے بچے، تمھارا پتہ کیا ہے؟ .... پھما شرما 46

معاشیات
• مفادِ عامہ اور حقوق انسانی .... بھرت جھن جھن والا 47

ہماری مطبوعات سے
• حکایت بادشاہ و باغبان کی (''تزک جہانگیری'' سے ماخوذ) .... جہانگیر 49
• آواز کو محفوظ کرنے میں کامیابی (''تاریخ ایجادات'' سے ماخوذ) .... ایگن لارسن 51

طلبہ کے لیے
• مینجمنٹ کے طلبہ کی بڑھتی اہمیت .... زبیر احمد بھاگلپوری 54

اردو خبرنامہ .... ادارہ 56

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 68

بچوں کا گوشہ
• رفیع احمد قدوائی (''ہمارے رہنما'' جلد ہشتم سے ماخوذ) .... ایرا سکسینہ 73
• بجلی کا مستقبل (اوپا کہانی) .... نندنی ست پتھی 79

آپ کی بات

■ **سلام بن رزاق، 11/9، ایل آئی جی کالونی، کرلا (ویسٹ) ممبئی۔70**

یوں تو ''اردو دنیا'' کے بیشتر شمارے بعض خصوصی مشمولات کے سبب محفوظ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مگر ستمبر 2006 کا شمارہ، گوشۂ احمد ندیم قاسمی، کی وجہ سے ایک یادگار شمارہ بن گیا ہے۔ گوشے میں شامل اشاعت، نظمیں، خاکے اور مضامین احمد ندیم قاسمی کے فن اور شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں تاہم محمد خالد اختر کا خاکہ نما مضمون ''ایک آدمی احمد شاہ نامی'' پڑھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مضمون کیا ہے، سیپی میں سمندر بند ہے۔

قاسمی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی مناسب ہے۔ ''بین'' کا شمار اگر چہ ان کے نمائندہ افسانوں میں نہیں ہوتا لیکن موضوع کی حد تک وہ آج بھی تازہ کار ہے۔ ابھی فی الحال ممبئی میں ایک درگاہ کے پاس سمندر کا پانی میٹھا ہو گیا تھا اور گجرات کے ایک مندر میں دیوی دودھ پینے لگی تھی۔ جب تک عوام کی اکثریت اس قسم کی ضعیف الاعتقادی کا شکار رہے گی 'بین' جیسے افسانوں کا موضوع کبھی باسی نہیں ہوگا۔

■ **ایم نسیم اعظمی، ہڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن (یو. پی.)**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (جولائی 2006) نظر نواز ہوا۔ رسالہ حسب دستور صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے بہتر اور معیاری ہے۔ سرورق پر اسکولی بچی کو بستے کے بوجھ کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی معروف انگریزی ادیب اور دانشور آر. کے. نارائن کا اسکولی بچوں پر بڑھتے بستے کے بوجھ کے بارے میں جو قول دیا گیا ہے، وہ نئے تعلیمی سال کے لحاظ سے انتہائی اہم اور معنی خیز ہے۔ موصوف کی اس اہم ترین رائے پر ہمارے تعلیمی ذمہ داروں کو پوری سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے تا کہ کم عمر اور معصوم بچوں کے بستے کے بڑھتے بوجھ کو کم کیا جا سکے اور ان میں تعلیم کا شوق اور سیکھنے کا اصل ذوق پیدا کیا جا سکے۔

زیر نظر شمارے میں ریاض احمد کا مضمون ''اردو نصاب سیکنڈری اور سینئر سکنڈری سطح پر'' کافی اہم اور قابل توجہ ہے۔ یہ مضمون اگر چہ ریاست جموں وکشمیر کی اردو نصابی کتب کے تناظر میں لکھا گیا ہے مگر جن خامیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی وہ ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں کی اردو نصابی کتب میں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً ہماری ریاست اتر پردیش میں تو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کی اردو نصابی کتب کی صورت حال انتہائی تشویشناک ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اردو زبان، اس کی تعلیم اور نصاب سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں یہاں کی نصابی کتابوں کی ترتیب وتشکیل دینے والی کمیٹی میں نہ تو شامل کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی رائے لی جاتی ہے۔ چند بڑے نام ہی بار بار نصابی کتابوں کی کمیٹی میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنھیں نہ بچوں کے ماحول، ان کی ذہنی صلاحیت اور ان کے اخذ کرنے کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ ہی علم۔ اس لیے یہ نصابی کتب عموماً غیر متوازن اور عدم دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں اور غلطیوں، خامیوں اور کوتاہیوں سے پُر بھی ہوتے ہیں جن سے بچوں کی لسانی آموزش کی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی ہے اور نہ ہی طلبہ میں زبان دانی کے ذوق کو فروغ ملتا ہے اور املا کی غلطیوں کا جو حال ہوتا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔

مذکورہ مضمون میں ریاض احمد نے اردو نصابی کتب کی کمزوریوں کو جس موثر انداز اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے وہ بہر حال قابل توجہ ہے۔ صرف اردو تعلیم کا نعرہ لگانے سے تعلیمی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے نصابی کتب سمیت تمام تعلیمی وسائل وذرائع کو افادی بنا کر اس کا بہتر استعمال کرنا ہوگا۔

■ **جاردا جن (پردیسی) گاندھی اسٹریٹ اترولی، ضلع علی گڑھ (یو. پی.)۔**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کا انتظار ایسے رہتا ہے جیسے کسی مسافر کو بہت دور جانے کے لیے ٹرین کا۔ اسے اردو دنیا کہوں یا علمی خزانہ یعنی کہ کوزے میں دریا۔ کون سا شعبہ ایسا ہے جس کی معلومات اس میں پیش نہیں کی جاتیں۔ طلبہ کے لیے یہ ایک قیمتی دستاویز ہے۔ آپ کا اداریہ ''ہماری بات'' ہمارے جذبات اور احساسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ پیش نظر شمارے (ماہ جولائی 2006) کے سرورق پر بیگ لٹکائے اسکولی طالبہ کی تصویر زبردست احساس دلاتی ہے کہ ہمارے بچے اس بوجھ کو کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ پیٹھ پر آٹھ دس کلو وزن، گھر آتے آتے الٹا سیدھا بیگ پھینکا اور پلنگ پر جا بیٹھے۔ امی کمر میں درد ہو رہا ہے۔ جیسے کتنی منزل طے کر کے آئے ہوں۔ پھر اسکول لے جانے والے لنچ باکس یا پھر ماں سے لے کر تھوڑا بہت کھانا کھایا اور چند لمحوں کے لیے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ والدہ کی سختی پر ہوم ورک کیا اور اس کے بعد پھر شام کو محلے کے بچوں میں گھل مل گئے۔ ان بچوں میں کچھ پڑھنے والے اور کچھ اسکول نہ جانے والے بھی، ہر طبقے کے بچے ہوتے ہیں۔ اس ماحول سے بچوں کے ذہن پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔ اس پر

غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے جب ہم پڑھتے تھے۔ ابتدائی جماعت سے لے کر ہائی اسکول تک ایک کپڑے کا تھیلا، تین چار کتابیں، چار پانچ کاپیاں، قلم وغیرہ کے ساتھ یعنی کہ جو کورس اس دن پڑھایا جاتا وہی ساتھ ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں اسکول کی طرف سے ناشتہ ملتا تھا سب کو چوتھے پانچویں گھنٹے میں اسکول کا چپراسی نوٹس لے کر آتا Games of Library are compulsory today یعنی کھیل اور لائبریری میں حاضری ضروری ہونی چاہیے۔ شامل نہ ہونے پر جرمانہ بھی کیا جاتا۔ لائبریری میں پڑھنے کے بعد جو وقت ملتا اس میں ہاکی، والی بال، فٹ بال، کبڈی اور کشتی وغیرہ کھیلتے۔ لیکن آج کل بچوں کی پیٹھ پر موٹی موٹی چھ سات کتابوں کے ساتھ ساتھ دس دس کاپیاں اور ساتھ میں پانی کی بوتل اور لنچ باکس — میں انگریزی کے ادیب جناب آر۔ کے۔ نارائن کے خیالات سے سو فیصد اتفاق رکھتا ہوں کہ بچوں کے بیگ کو ہلکا کرنا اشد ضروری ہے۔

جو کتاب جس دن پڑھائی جائے نظام اوقات بنا کر وہی کتاب کاپی دی جائے۔ بستہ بھی مضبوط لیکن ہلکا ہونا چاہیے۔ پانی کی بوتل سے بھی بچوں کو نجات دلائی جائے۔ صاف پانی اسکول کی جانب سے مہیا کرایا جانا چاہیے۔ کولر میں ایکوا گارڈ ضرور لگا ہونا چاہیے۔ اسکول میں ہی ایک دارالمطالعہ ہو جہاں کورس کے علاوہ بچوں کا ادب، اصلاحی اور معلوماتی کتابیں ہوں جس کے لیے ایک پیریڈ بھی ضروری ہو۔ میری ناقص رائے میں اس طرح سے بچوں کے بیگ میں دو تین کلو وزن کم ہو جائے گا۔ میں بچوں کے والدین سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ بچوں کے لیے ایک کتب خانہ قائم کریں، طلبہ وقتِ مقررہ پر اس میں پڑھیں۔ ٹیلی ویژن اور کھیل کے لیے بھی وقت مقرر ہو۔ اسکول نہ جانے والے بچوں کے ساتھ ہرگز نہ کھیلنے دیں۔

دیگر شماروں کی طرح ماہ جولائی کے شمارے میں ''ہماری بات'' سے لے کر ہر مضمون اپنی جگہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم جس کے متعلق مولانا حالی نے بھی کہا تھا:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
عورت جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے

میرا بھی یہی خیال ہے کہ اگر ایک لڑکی تعلیم یافتہ ہوگی، پورا خاندان پڑھا لکھا ہوگا کیوں کہ آج کی بیٹی کل کی ماں ہوگی اور ماں سے بہتر کوئی استاد نہیں ہو سکتا۔ ''بچپنے کی نیند تو اب خواب ہوگئی'' — ''سرسید کا بچپن'' بھی بے حد معلوماتی مضامین ہیں۔ بچوں کے گوشہ کے ساتھ اگر ایک صفحہ ''خواتین'' کے لیے بھی وقف ہو تو اور اچھی بات ہوگی۔

■ عبدالوحید چوہان، ملو جی مسجد، اندرون سرہندی گیٹ، مالیر کوٹلہ، پنجاب۔

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ رسالہ کتابی سائز میں شائع ہوا کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے ابتدائی درجات کی سطح پر اتنا زور نہیں دیا جاتا، جتنا ہائی اسکول اور کالج کی سطح پر۔ جب نچلی سطح سے اردو کے طالب علم نہیں آئیں گے تو کالجوں میں اردو تعلیم کی ترقی کیسے ہوگی؟ بعض اوقات تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے طلبہ اپنا نام اردو زبان میں صحیح ڈھنگ سے لکھ نہیں پاتے۔ اصل وجہ اس کی یہی ہے کہ ابتدائی درجات میں اردو زبان صحیح ڈھنگ سے نہیں پڑھائی جاتی۔ اگر یہی صورت حال رہی تو اردو رسالوں اور اخباروں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ حکومت کو ابتدائی درجات میں اردو زبان کی تعلیم کے لیے اچھے اور محنتی اساتذہ کا انتظام کرنا چاہیے۔ نجی اسکولوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔

■ احمد صغیر، منی مسجد گوال بگہہ، گیا (بہار)

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ معلوماتی ہوتا ہے۔ اس بار گوشۂ احمد ندیم قاسمی خاصے کی چیز ہے۔ اتنے کم وقت میں کسی بھی فنکار پر گوشہ شائع کرنا مشکل کام ہے لیکن آپ نے کر دکھایا۔ غالباً ''اردو دنیا'' قاسمی پر گوشہ نکالنے میں پہلے نمبر پر رہا۔ اس شمارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی، نند کشور وکرم، رفعت سروش، جمیل الدین عالی اور راشد انور راشد کے مضامین نے متاثر کیا۔

■ زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ۔15

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (جولائی 2006) موصول ہوا۔ خصوصاً ''زبان اور تعلیم'' کا گوشہ انتہائی معلوماتی اور بھرپور ہے۔ ریاض احمد کا مقالہ ''اردو نصاب — سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر'' اپنے موضوع پر ایک بہترین مضمون ہے۔ موجودہ اردو نصاب تعلیم پر ان کی گہری نظر ہے۔ ادھر ''اردو دنیا'' کے تنوع اور اس کی رنگا رنگی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ آج کا دور مسابقت کا ہے اس لیے طلبہ کی رہنمائی سے متعلق مضامین میں اضافہ ہو تو بہتر ہوگا کیوں کہ یہی طلبہ قوم کا مستقبل ہیں۔ ''روبرو'' بھی پسند کیا جا رہا ہے۔

■ رضوان خاں، شیخ سرائے، سیتاپور۔ 261001

''اردو دنیا'' شمارہ ستمبر 2006 موصول ہوا۔ گوشۂ احمد ندیم قاسمی شائع کر کے آپ نے مرحوم قاسمی صاحب کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔ بلاشبہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ احمد ندیم قاسمی کو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اردو دنیا میں یکساں طور پر مقبولیت حاصل تھی۔ نیز ان کے کلام کا ترجمہ دوسری

زبانوں میں بھی ہوا جس کی وجہ سے ان کی شناخت دوسرے حلقوں میں بھی بنی اور انھیں ان حلقوں میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس شمارے میں شامل دیگر مضامین میں عبدالودود انصاری کا ''غریب انسان کامیاب سائنس داں'' بھی اچھا لگا۔ یہ مضمون ہمیں کچھ اچھا کرگزرنے کی تحریک دیتا ہے۔ ''نجے گوڑبولے سے گفتگو'' بھی پسند آئی۔ گوشۂ اطفال میں حیدر بیابانی کی نظم ''الیکشن'' بہت اچھی لگی۔ شاعر نے بڑی مہارت کے ساتھ آسان اور مؤثر زبان میں جانوروں کو کردار بنا کر ایک ایسی علامتی نظم لکھی ہے جو مختلف اشخاص کے مزاج، برتاؤ اور ان کی ذہنیت کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اردو خبرنامہ کے تحت ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر ممبئی یونیورسٹی میں مکالمہ پر مبنی تفصیلی خبر پڑھی۔ پروفیسر گیان چند جین کی اس کتاب پر جناب شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر عبدالستار دلوی، ایوب واقف اور سلام بن رزاق جیسے معتبر اور غیر جانب دار ادیبوں نے جو اعتراضات کیے ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جین صاحب کی یہ کتاب تعصب اور مفروضات پر مبنی ہے۔

■ **محمد ناظم علی، نظام آباد، آندھرا پردیش۔**

آپ نے گوشۂ احمد ندیم قاسمی شائع کر کے انھیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ان پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ اس گوشے میں احمد ندیم قاسمی کی زندگی، شخصیت اور ادبی کارناموں پر جامع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

■ **نشاط انور راعینی، راعین کالج، پورب سرائے، شمس لین، مونگیر (بہار)۔811201**

''اردو دنیا'' اپنی گوناگوں ظاہری و معنوی خوبیوں کی وجہ سے موجودہ اردو رسائل میں ممتاز و نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ نے ترتیب و تزئین میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ قارئین کا ہر طبقہ اس کے مطالعے سے اپنے ذوق کی تسکین کر سکے۔ جولائی کے شمارے میں ''وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہوگئی'' از حد پسند آیا۔ صحت و سائنس کے موضوعات پر مضامین کا سلسلہ اب مزید بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ اردو خبرنامہ، تبصرہ و تعارف بھی بے حد معلوماتی کالم ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت عمدہ ہے۔ اس معیاری اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

■ **شاغل ادیب، مشیر آباد، حیدرآباد۔48 (آندھرا پردیش)**

''اردو دنیا'' اگست 2006 باصرہ نواز ہوا۔ اس بار ممتاز عالم کی محترم عابد سہیل سے گفتگو، افسانہ، ناول اور ناولٹ پر مفید مطلب بحث لیے ہوئے ہے۔ پروفیسر سید احسان الرحمن کا ''فن ترجمہ نگاری'' بھی اچھا مضمون ہے۔ کمال احمد صدیقی کا مضمون کشمیر جنت نشاں کے سابقہ معاشرتی، علمی و ادبی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ گوشۂ ادب میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' بہت پر اثر ہے۔ زبیر رضوی نے اپنے مضمون ''فسادات اور اردو کا افسانوی ادب'' میں مرحوم قاسمی صاحب کے مذکورہ افسانے پر جو تاثرات پیش کیے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ اس افسانے کے علاوہ رضوی صاحب نے فسادات کے عنوان پر منٹو، قدرت اللہ شہاب، بیدی اور جن دیگر افسانہ نگاروں اور ان کے یادگار افسانوں کی تفصیل پیش کی ہے وہ بھی قابل ستائش ہے۔ اظہار اثر کا مضمون ''مقبول عام ادب'' مختصر سہی مگر پر مغز ہے۔

■ **فہمیدہ پروین، حور بانو منزل، ہشانتی نگر، رانچی۔1**

جولائی کے شمارے میں آپ نے ایک معصوم بچی کی تصویر کتابوں سے بھرے تھیلے کے ساتھ شائع کی ہے اور ہماری بات کے تحت اس مسئلے پر بھرپور اداریہ لکھا ہے۔ حکومت کو فوراً اس مسئلے کے حل کی جانب توجہ دینی چاہیے۔

''پروفیسر علی رفاد فتیحی سے گفتگو'' بے حد کارآمد ہے۔ اس میں اردو کے مسئلے پر اچھی گفتگو ہوئی ہے اور فتیحی صاحب نے جواب بھی سلجھے ہوئے انداز میں دیے ہیں۔ وودھا کول کا مضمون ''وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہوگئی بہترین مضمون ہے۔ اس کا ترجمہ بھی رواں دواں ہے۔ محمد عمر رضا کا مضمون ''تمباکونوشی'' اور عبدالواحد کا مضمون ''طبی لاپروائی اور قانون تحفظ صارفین 1986'' معلومات افزا ہیں۔ ممتاز احمد نے فارسی افسانہ نگار صادق ہدایت کے افسانے 'داش آکل' کا اردو ترجمہ بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔

■ **عبدالباری مسعود، فلیٹ نمبر۔9، تیسری منزل، 168/2، جھاہاؤس بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔13**

برطانیہ میں اردو کی صورت حال پر ایک رپورٹ بصورت مضمون پیش خدمت ہے۔ جو راقم السطور کے ذاتی مشاہدات اور متعلقہ افراد اور محکموں سے ملاقات پر مبنی ہے۔ واضح رہے کہ برطانیہ کے دفتر وزارت خارجہ کی دعوت پر ہندوستان کے پانچ اردو صحافیوں نے جس میں خاکسار بھی شامل تھا، گذشتہ دنوں برطانیہ کے مختلف شہروں کا دورہ کیا تھا۔

''اردو دنیا'' پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی پر آپ نے خصوصی گوشہ شائع کر کے انھیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

□□□

ہماری بات

ابتدائی جماعتوں میں بچوں کے داخلے جلد ہی شروع ہونے والے ہیں جس میں فارم نکلنے سے داخلے تک تین چار مہینے لگ جاتے ہیں۔ جن والدین کو اپنے بچوں کا داخلہ کرانا ہے وہ ابھی سے پریشان ہیں کہ اپنی پسند کے اسکول میں اپنے بچے کا داخلہ کرانے میں کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب کار ثواب کے لیے اسکول کھولے جاتے تھے اور بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بنیادی مقصد قوم اور وطن کی فلاح تھا۔ لیکن آج کے صارفی عہد میں تعلیم کو بھی کاروبار کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور پورے ملک میں نجی اسکولوں کا سیلاب سا آگیا ہے۔ بعض نجی اسکولوں کے بارے میں یہ شکایت ملی ہے کہ وہ تعلیم کے نام پر والدین کا استحصال کرتے ہیں۔ اسکول لباس، کتابیں، کاپیاں، کاغذات، اسکول بس، ہر چیز کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہے اور ہر مد میں زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ والدین کو ہدایت بھی دی جاتی ہے کہ وہ کون سا سامان کس دکان سے خریدیں۔ آج کے حالات میں کمزور آدمی بھی اپنے روز مرہ کے اخراجات میں کمی کر کے اپنے بچے کا داخلہ پرائیویٹ اسکول میں کرانے کا خواہش مند رہتا ہے تاکہ اس کا بچہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے اور اس کا مستقبل بہتر ہوسکے۔

بہت سے اسکول بچوں کا داخلہ لینے سے پہلے یا داخلے کے وقت فیس کے نام پر رقم وصول کرنے کے ساتھ ساتھ والدین اور بچوں کا انٹرویو بھی لیتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور یہ والدین کے لیے بھی پریشان کن ہوتا ہے۔ انٹرویو کے بہانے یہ اسکول والدین کی معاشی حالت اور سماجی سطح کا اندازہ لگا کر بچوں کو داخلہ دیتے ہیں۔ بعض معاملات میں انٹرویو کا مقصد محض خانہ پری ہوتا ہے، امیدواروں کا انتخاب پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس پورے عمل میں شفافیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور نہ والدین کو یہ جاننے کا کوئی حق ہوتا ہے کہ ان کے بچے کا داخلہ کیوں نہیں ہوا اور داخلے کا معیار کیا ہے۔

انٹرویو کے نام پر ہونے والی کارگذاری پر دہلی ہائی کورٹ میں مفاد عامہ کی ایک رٹ دائر ہوئی جس پر غور کرتے ہوئے عدالت نے ایک سال قبل انٹرویو پر پابندی عائد کرتے ہوئے نجی اسکولوں کو اس کا متبادل تلاش کرنے کی ہدایت دی۔ اس ضمن میں کئی طرح کے مشورے سامنے آئے۔ مثلاً اسکول کے آس پاس کے علاقوں کے بچوں کو داخلے میں اولیت دی جائے۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ جن علاقوں میں اچھے اسکول نہیں ہیں وہاں کے بچے اچھی تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ تمام اسکولوں کا مشترکہ داخلہ فارم نکالنے کا مشورہ بھی سامنے آیا کہ اس سے والدین کا وقت بھی بچے گا اور بچوں کو انٹرویو سے بھی نجات ملے گی۔ لیکن یہ بھی ممکن العمل نہیں کیوں کہ ہر اسکول کی اپنی الگ ترجیحات ہیں اور وہ سماج کے مختلف طبقوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر کھولے گئے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان والدین کے دوسرے بچے کو بھی اسی اسکول میں داخلہ دیا جائے جس میں ان کا پہلا بچہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ لیکن اس میں ان والدین کو دقت پیش آئے گی جنھیں اپنے پہلے بچے کا داخلہ کرانا ہے۔ ''پہلے آیئے/ پہلے پایئے'' کے اصول پر عمل کرنے کی تجویز بھی سامنے آئی۔ لیکن یہ بھی قابل عمل نہیں ہے کیوں کہ اس میں لمبی قطار لگے گی، افراتفری کا ماحول ہوگا اور اپنے بچے کا داخلہ پہلے کرانے کی کوشش میں جھگڑا فساد بھی ہونے کا خدشہ برقرار رہے گا۔ داخلے کے لیے بچوں کا انتخاب کرنے کے لیے لاٹری یا قرعہ نکالنے کا طریقہ بھی زیر غور آیا۔ لیکن یہ بھی کوئی بہت بہتر اور مناسب طریقہ نہیں ہے کیوں کہ اس میں بھی بدعنوانی کا پورا امکان ہے۔

آخر کار ایک سال کی مدت میں نجی اسکولوں نے انٹرویو کا جو متبادل تلاش کیا وہ یہ تھا کہ وہ بچوں اور ان کے والدین سے غیر رسمی ملاقات کو ترجیح دیں گے جس کے تحت بچے کی صلاحیت کا جائزہ لیا جائے گا اور والدین کی تعلیمی اہلیت معلوم کی جاسکے گی۔ عدالت نے یہ تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دی ہے کہ یہ انٹرویو کی ہی دوسری شکل ہے جس کا نام ''انٹرایکشن'' (تعامل) رکھا گیا ہے۔ اب عدالت نے سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری اسکول ایجوکیشن کے چیئرمین جناب اشوک گانگولی کی صدارت میں ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے جسے اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے چھ ہفتے کا وقت دیا گیا ہے۔ اس میں ممتاز ماہرین تعلیم اور کئی نجی اسکولوں کے پرنسپل شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کمیٹی انٹرویو کا متبادل تلاش کرنے اور داخلے کے عمل میں شفافیت لانے کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ معاملے کی اگلی سماعت 17 اکتوبر 2006 کو ہونی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایک ایسا قابل عمل طریقہ کار سامنے آئے گا جو بچوں کے داخلے سے متعلق والدین کا تناؤ دور کرنے میں معاون ہوگا اور نجی اسکولوں کی من مانی پر صحیح معنوں میں روک لگائی جاسکے گی۔

□□□

فیروز عالم

وریندر پٹواری سے گفتگو

جناب ویریندر پتواری کا شمار عہد حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش گیارہ ستمبر 1940 کو سرینگر (کشمیر) میں ہوئی۔ آپ پیشے سے انجینئر ہیں اور ایگزیکٹیو انجینئر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ آپ نے 200 سے زیادہ اردو افسانے اور کوئی دو درجن کشمیری افسانے لکھے ہیں جو ملک اور بیرون ملک کے مختلف مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ آپ کے اردو افسانوں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

فرشتے خاموش ہیں (1981)، دوسری کرن (1986)، بے چین لمحوں کا تنہا سفر (1988)، آواز سرگوشیوں کی (1994)، ایک ادھوری کہانی (2002) اور افق (2003) ۔ آپ کے ڈراموں کا مجموعہ ''آخری دن'' (1983) اور ناولٹ ''کب بھور ہوگی'' (2000) کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جناب ویریندر پتواری نے بڑی تعداد میں ریڈیو ڈرامے، اسٹیج ڈرامے، ٹی.وی. ڈرامے، ٹی.وی. سیریل اور فلموں کے اسکرپٹ بھی تحریر کیے ہیں۔

جناب ویریندر پتواری کی کتابوں ''دوسری کرن'' اور ''آواز سرگوشیوں کی'' پر بہار اردو اکادمی نے بالترتیب 1988 اور 1996 میں انعام بھی پیش کیا تھا۔ آج کل آپ دہلی میں قیام پذیر ہیں اور فالج کے حملے کے باوجود مسلسل علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔آپ سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہیں۔

سوال: آپ افسانہ نگاری کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: ہمارے گھر میں ''شاعر'' اور ''بیسویں صدی'' جیسے بیشتر جرائد آیا کرتے تھے اور میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ اپنی ریاست کے قدآور افسانہ نگار ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ اور نور شاہ کی کہانیاں یوں پڑھا کرتا تھا گویا ایک جھیل کے کنارے بیٹھا آتی جاتی سحر انگیز لہروں کو دیکھا کرتا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہوں کہ اگر لہریں دور دور سے آکر جھیل کے کنارے سے لپٹ کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ کنارے ہی آواز دے کر یوں بلا رہے ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ کسی بھی موضوع کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر کچھ عملی اور کچھ تصوراتی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یعنی ایک واقعہ، حادثہ، سانحہ یا المیہ بھی ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ ایک ہی شخص کسی کے نقطۂ نگاہ سے شہید بن جاتا ہے اور کسی دوسرے کی نظر میں وہ غدار کہلاتا ہے۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ میرا زاویہ مختلف ہے تب میں خود افسانے لکھنے لگا۔ اور یوں افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوا۔

سوال: آپ کا پہلا افسانہ کب اور کس رسالے میں شائع ہوا؟

جواب: میرا پہلا افسانہ بعنوان ''سسکیاں'' 1965 میں بمبئی کے ایک جریدے ''صبح امید'' میں شائع ہوا تھا۔

سوال: کیا آپ کے گھر میں ادبی ماحول تھا؟

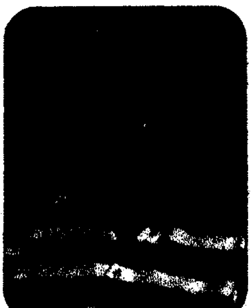

جواب: جی نہیں! میرے ابا آنجہانی پنڈت پریم ناتھ پٹواری مسرور کشمیری کو اردو زبان سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ ان کی بزم میں شعرا اور ادبا شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ماحول شاعرانہ ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں، میں جہاں فلمی گیت گایا کرتا تھا وہاں اپنے ابا کی نظمیں بھی گنگنایا کرتا تھا۔ حالانکہ ان کے مطلب سے قطعی ناآشنا ہوا کرتا تھا۔ خوشے کو گوشے کہنے پر ایک زبان داں باپ نے اپنے دس سال کے بیٹے کی پٹائی کی تھی۔ پہلی اور آخری بار۔ اس کے بعد زبان اور تلفظ پر توجہ دینا بعد میں ایک ضرورت بن گئی۔

سوال: آپ پیشے سے انجینئر رہے ہیں اور مزاجاً ایک ادیب، ان دونوں میں کس طرح سے ہم آہنگی قائم رکھی؟

جواب: ایک سول انجینئر اور ایک ادیب کے درمیان ایک گہری خلیج پر میں

نے ایک پل بنایا تھا اور وہ پل میں خود تھا جس پر یک طرفہ ٹریفک کنٹرول کرنے والا بھی میں تھا۔ اس لیے کبھی کسی ذہنی تناؤ کا شکار، ٹکراؤ کی وجہ سے، نہیں ہو پایا۔ ہاں مگر یہ سچ ہے کہ انجینئر مجھے ایک ادیب سمجھ کر اور ادبی حلقے مجھے ایک انجینئر ہونے کے لیے رعایتیں دیا کرتے تھے۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے رعایتوں کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں لیا۔ وہ سلسلہ اب بھی جاری ہے حالانکہ ایک حادثے کی وجہ سے میرا انجینئرنگ کیریئر ایک پتھر کی طرح گہرے پانی میں ڈوب گیا!

سوال: جس زمانے میں آپ نے افسانے لکھنے شروع کیے اس وقت کی ادبی فضا کیسی تھی اور آپ کن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے؟

جواب: ترقی پسند ادب کی بہاریں پر کیف ہوا کرتی تھیں۔ مرحوم کرشن چندر میرے پسندیدہ افسانہ نگار تھے اور اپنی ریاست کے نور شاہ کی رومانی کہانیاں مجھے تب بھی اور اب بھی اچھی لگتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی ہر کہانی معاشرے کی ایم آر آئی (M.R.I.) رپورٹ ہوتی ہیں۔ احتیاط اور علاج دونوں کے لیے۔

سوال: فکر و فن کے اعتبار سے کس افسانہ نگار کی تخلیقات آپ کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں؟

جواب: خواجہ احمد عباس کی بامقصد کہانیاں، راجندر سنگھ بیدی کے اچھوتے موضوعات، کرشن چندر کا منفرد اسلوب، جوگندر پال کی نرالی کہانیاں جو وہ چند سطور میں بیان کرتے ہیں اور گلزار کی چونکا دینے والی ''مرد'' جیسی کہانیاں۔

سوال: آپ کے افسانوں میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے زوال کا نوحہ کثرت سے ملتا ہے۔ کیا اب آپ اس بات سے ناامید ہو گئے ہیں کہ ہندو مسلم تعلقات پھر سے خوشگوار ہو سکیں گے؟

جواب: قدرت نے حیات کے لیے صاف و شفاف پانی میسر کیا۔ ہم نے اس کو آلودہ کر دیا ہے۔ سیاست نے بھی ہندوستانی تہذیب کو آلودہ کر کے جسمانی طور پر نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ اپنی زہریلی آلودگی میں قید کر کے ہندو روبوٹ اور مسلم روبوٹ بنا دیے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جس دن ان روبوٹوں کو آپس میں لڑانے والوں کو ہندو مسلمان ایک کارواں بنا کر شیطانی قلعوں کو اڑا دیں گے ہجوموں میں کھوئے، اپنوں سے بچھڑے لوگ ایک ہو کر، ایک پر سکون و خوشحال زندگی گزاریں گے۔ مجھے خوشگوار تعلقات کی دستک سنائی دے رہی ہے۔ ہاں!۔!!

سوال: مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے احیا کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: میل جول، تبادلۂ خیالات، ہم خیال لوگوں کی جذباتی ہم آہنگی ایک ہی راستے پر ایک ہی کارواں اور ایک ہی منزل۔ یہ سوچ کر کہ شطرنج کے ماہر کھلاڑی بساط تو بچھا سکتے ہیں مگر مہروں کے بغیر جنگ کا کھیل نہیں کھیل سکتے۔!

سوال: اپنے افسانوں کے موضوعات آپ کس طرح اور کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟

جواب: گرد و پیش پر نظر رکھتا ہوں۔ جھیل میں مچھیرے کے پھینکے ہوئے جال کی طرح وہ سب دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو مچھلیوں کے انتظار میں بیٹھا مچھیرا دیکھ نہیں پاتا۔ غم اور خوشی کے واقعات سے بنے حالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔ حالات سے ٹھونسے گئے واقعات خاص طور پر فسادات کے بارے میں کم اور ان کے زد میں آئے ہوئے لوگوں کے درد اور کرب کو خود محسوس کرتے ہوئے اپنا حال دل بیان کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

سوال: افسانے کے اجزائے ترکیبی میں آپ سب سے زیادہ اہم کسے خیال کرتے ہیں اور کیوں؟

جواب: اپنے خیالات، احساسات، محسوسات، خدشات، صدمات کو ظاہر کر کے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کچھ Convey کر پاؤں اور ایک نئی سحر کے اجلے پن کا انتظار کرتا رہوں۔

سوال: ہم عصر افسانہ نگاروں میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

جواب: ہم خیال ہم عصروں سے متاثر ہوں۔ اپنی ہی ریاست کے دو قلم کاروں عمر مجید اور آنند لہر کی کہانیوں کو بے حد پسند کرتا ہوں۔

سوال: ہندو پاک میں موجودہ عہد میں خاصی تعداد میں افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں کہاں زیادہ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں؟

جواب: اگر کسوٹی انتظار حسین کے افسانے ہیں تو پاکستان میں زیادہ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں اور اگر کسوٹی جوگیندر پال کے افسانے، ہیں تو ہمارے ملک کے افسانوں کا معیار بہتر ہے۔ کبھی کبھار پاکستان کے مدیران اپنے جریدے بھیجتے رہتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر لکھے جا رہے افسانوں کے بارے میں زیادہ معلومات کا فقدان ہے۔ اگر وہاں احمد ندیم قاسمی تھے تو یہاں ان کا شاگرد گلزار ہے۔ ہاں یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں تخلیق پر اور ہمارے یہاں تحقیق پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ جو قلم کار اپنی مادری زبان میں اپنی چھاپ چھوڑے بغیر ہندی میں ایک کتاب لکھتے ہیں تو ان کو کتاب کا معیار نظر انداز کر کے ایک لاکھ روپے کا انعام ملتا ہے جب کہ اردو میں لکھنے والوں کو اعلیٰ معیار کی تخلیقات پر ایسے اعزازات سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جانے کیوں؟

سوال: اچھے افسانے کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟

جواب: موضوع اچھا ہو۔ اسلوب بہتر ہو اور زبان میں روانی ہو۔ اس سے زیادہ اہم یہ کہ افسانہ قارئین کے لیے ایک صفحہ بن کر ناقدین کی سوچ کے دائرے میں قید نہ رہے بلکہ قارئین کے دل کو چھو کر دماغ تک پہنچ جائے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ آپ نے ٹیلی ویژن کے لیے بہت سارے ڈرامے اور سیریل بھی لکھے ہیں آپ بحیثیت ادیب اپنی کس صنف سے مطمئن ہیں؟

جواب: میری اب تک شاعر، بیسویں صدی، آج کل، انشا، جیسے ادبی قومی اور بین الاقوامی جرائد میں 221 کہانیاں شائع ہو چکی ہیں جنھیں کافی پسند کیا گیا۔ ''فرشتے خاموش ہیں''! ''دوسری کرن''، ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر''، ''آواز سرگوشیوں کی''، ''ایک ادھوری کہانی'' اور ''اُفق'' کے عنوانات سے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دو اور کہانیوں کے مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر'' پر جموں یونیورسٹی میں ایم فل کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ ''آخری رات'' میرے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے ''انسان'' میرے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے جو جلد ہی شائع ہوگا۔ میں نے ایک ناولٹ ''کب بھور ہوگی؟'' دیوناگری میں شائع کیا تھا اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک طویل نظم ہی ناولٹ ہے۔ میں نے ٹی.وی. کے لیے کئی ڈرامے، ٹیلی فلمیں اور کشمیری کے علاوہ اردو میں بہت سارے سیریل لکھے ہیں۔

چونکہ ٹی.وی. یا فلم میں ایک تیسرا رخ (Third Dimension) مل جاتا ہے اور فنون لطیفہ کے مختلف رنگ مثلاً ''موسیقی، سیٹس (Sets) لوکیشن کے علاوہ مکالموں کو ڈرامائی شیڈز (Shades) مل جاتے ہیں۔ ایکشن اور ری ایکشن (Action & Reaction) کی مدد سے منظر تحریر سے تصویر بن جاتا ہے اس لیے مجھے ذاتی طور پر قارئین کے لیے افسانے اور ناظرین کے لیے سیریل لکھنا اچھا لگتا ہے۔ کاش دوردرشن کا ایک اردو چینل ہوتا اور وہاں سے افسانوں کا ٹی.وی. روپ دیکھنے کو ملتا۔ تقریباً بیس برس پہلے مرحومہ عصمت آپا کے افسانے ''دوزخ'' کو دیکھ کر ناظریں جھوم اٹھے تھے۔

سوال: آپ نے زندگی کا اتنا بڑا حادثہ برداشت کر لیا ہے، جسمانی ناتوانی کے باوجود آپ نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟

جواب: زندہ رہنے کے لیے سانسوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ میرا قلم جب میرے ہاتھ میں ہوتا ہے تو بقول ناصر کاظمی:

غم ہے یا خوشی ہے تُو
میری زندگی ہے تُو!

سوال: ملک میں اردو کی مجموعی فضا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: کچھ کہا بھی نہ جائے مگر چپ رہا بھی نہ جائے۔ زبان ادب کو تاثیر مسیحائی دیتی ہے۔ اردو کا کوئی چھوٹا یا بڑا قلم کار۔ اپنی پانچ سو کتابوں کے ذریعے عام قارئین تک نہیں پہنچ پاتا بلکہ ان معیاری جرائد کی بدولت بھی قارئین تک نہیں پہنچ پاتا ہے جن کی پانچ ہزار کاپیاں چھپتی ہیں۔ اس لیے اگر ایک ایسا جریدہ نکالا جائے تو بڑا کام ہوگا۔ سیمینار وغیرہ میری سمجھ کے مطابق بے اثر نہ سہی موثر نتائج نہیں دے پاتے۔''

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میری نظر میں کونسل نے جوگلزار کی لکھی فلموں کے منظر نامے کتابی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل تعریف قدم ہے اور پھر مرحوم آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کتابی شکل میں شائع کرنے کا کام میرے لیے متبرک کتابیں ہیں۔ آپ کے جریدے ''اردو دنیا'' میں ادبی سرگرمیوں سے متعلق ''اردو خبر نامہ'' سے اعلامات ملتی رہتی ہیں۔ یہ اچھے اقدامات ہیں۔ تازہ شمارے کا خوبصورت سرورق اور اس پر شہنشاہ موسیقی نوشاد علی کی پُرکشش تصویر دیکھ کر مدیر ''اردو دنیا'' کے ذوق جمال کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان باتوں پر ذرا زیادہ توجہ دی جائے تو ایک اجنبی بھی کسی بک اسٹال پر ایک ادبی میگزین کے خوبصورت کور کو دیکھ کر متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایک بار ہاتھ میں آجائے اور اندر دلچسپ مواد ہو تو رسالہ بار بار خریدنے کو جی چاہے گا۔ ایسے اقدامات کونسل کی مطبوعات کی فروخت میں مددگار ثابت ہوں گے۔ آپ کا جریدہ انجمن بن کر آپ کے اقدامات اور مقاصد ملک کے کونے کونے تک بکھرے بچھڑے اردو کے قارئین کو ایک دوسرے سے جوڑ دے گا۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: دنیا بھر کے اردو زبان سے پیار کرنے والو— تحقیق یا تنقید تب کی جاتی ہے جب تخلیقات سامنے ہوں۔ اس لیے تخلیقات کی آبیاری کرنے کے لیے ایک ہو جاؤ۔ ورنہ لنک رہے پودے تناور درخت بن جانے سے پہلے اپنا وجود کھو بیٹھیں گے اور پھر اردو زبان کے تازہ ترین خدوخال دیکھنے کی بجائے ہمیں اردو کی تاریخ پڑھنے کو ملے گی گویا منوہری کی عشقیہ داستان کو بھول کر لوگ موہن جوداڑو کے کھنڈرات کی تواریخ پڑھ لیں گے۔

□□□

شمس الرحمن فاروقی

خورشید الاسلام کی یاد میں

خورشید الاسلام صاحب کے بارے میں پہلی بات جو مجھے یاد آتی ہے وہ ان کی خوش صورتی اور خوش آوازی ہے۔ نہایت وجیہ، بلند و بالا، تھوڑا سا دوہراپن لیے ہوئے خوش پوش بدن۔ بہت متین، مردانہ، بھاری آواز، ایسی مرعوب کن آواز کہ اچھے اچھے خطیبوں کو غبطہ ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے آخری دن یاد آتے ہیں، معذوری، بیچارگی، ذہنی اور جسمانی واماندگی، تو دل رنج سے خون ہونے لگتا ہے اور خوف سے لرزنے بھی لگتا ہے کہ جب ان جیسے عمدہ نمونۂ ذات بشری کا یہ حال ممکن ہے تو ہم میں سے کون بھلا خود کو محفوظ تصور کر سکتا ہے اور پھر ان کی وہ خود اعتمادی، بلکہ رعونت، غیر معمولی علم کا وقار، صاف گوئی، یہ سب باتیں مل کر ایک ایسے شخص کا تصور پیدا کرتی ہیں جو عام انسانوں سے الگ ہی کوئی شے تھا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، علی گڈھ میں سجاد حیدر یلدرم پر سیمینار ہو رہا تھا۔ قرۃ العین حیدر بھی موجود تھیں۔ سب لوگ حسب توفیق کوشش میں تھے کہ سجاد حیدر یلدرم کی ادبی اور انسانی خوبیاں بیان کی جائیں۔ کچھ لوگوں نے یہ تاثر بھی پیدا کرنا چاہا کہ ترکی ادب، جس سے یلدرم نے بہت کچھ استفادہ اور ترجمہ کیا تھا، بہت اعلیٰ درجے کی چیز اور اردو والوں کے لیے لائق تقلید تھا۔ آخری دن کے شاید آخری اجلاس میں خورشید صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ خورشید صاحب نے بے دھڑک کہا کہ سجاد حیدر یلدرم ایک معمولی درجے کے ادیب تھے اور خود ترکی ادب بھی کوئی بہت عظیم ادب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ترکی کے سب سے بڑے شاعر کا نام فضولی تھا اور اس کے یہاں فضول خیال آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ ترکی شاعر اور ترکی ادب کے بارے میں ان کی پست رائے ہر چند کہ درست نہ تھی، لیکن انھوں نے بہت اعتماد کے ساتھ ایک لمبی تقریر کی اور سجاد حیدر یلدرم کو ایک معمولی تقلیدی ذہن کا مالک بتایا۔ انھوں نے ہرگز یہ خیال نہ کیا کہ قرۃ العین حیدر موجود ہیں اور وہ بہت حساس خاتون ہیں اور وہ آزردہ بھی ہو سکتی ہیں۔

علی محمد خسرو کی وائس چانسلری اور خورشید الاسلام صاحب کی صدارت شعبۂ اردو کے زمانے میں کسی بات پر خسرو صاحب اور خورشید صاحب میں اختلاف رائے ہو گیا۔ خورشید صاحب نے بھرے جلسے میں کہا کہ خسرو صاحب آپ یونیورسٹی کا انتظام چلائیں، شعبے کا انتظام اہل شعبہ پر چھوڑ دیں۔ لیکن وہ علی محمد خسرو ہی کیا جو ایسے موقعے پر انتہائی برجستہ اور مناسب جواب نہ دے سکے۔ خسرو صاحب نے کہا، جب میں ایک شعبے کے امور میں دخل نہیں دے سکتا تو یونیورسٹی کیا خاک چلاؤں گا۔ بات خسرو صاحب ہی کی چلی، لیکن وائس چانسلر سے اس طرح گفتگو کرنے کا یارا سب میں نہیں ہوتا۔

خورشید الاسلام صاحب کو بہت کم عمری میں بہت شہرت اور عزت مل گئی۔ وہ اپنے وقت میں نابغۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے علامہ شبلی پر مضمون لکھا جو علی گڈھ میگزین میں شائع ہوا۔ اسے پڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا، ''کالج میگزین میں خورشید الاسلام صدیقی کا ایک مضمون شبلی مرحوم پر نکلا ہے۔ انھوں نے شبلی مرحوم کی نسبت جو رائیں قائم کی ہیں ان سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ان کا اسلوب تحریر دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میں نے ہمیشہ افسوس کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اردو میں ایک عام تقلیدی رنگ کے سوا تجدید و تازگی مفقود ہے...... یہ مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انھیں معلوم ہو یا نہ ہو، لیکن انھوں نے ایک فرنچ اسکول کا تتبع کیا ہے۔'' اسی طرح، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے خورشید صاحب کے امراؤ جان ادا والے مضمون کے بارے میں لکھا، ''رسالے کا بیت الغزل خورشید الاسلام صاحب کے مضمون ''امراؤ جان ادا'' کو سمجھنا چاہیے...... خورشید الاسلام صاحب کی جدت نظر اور قوت انشا پردازی میں کلام نہیں۔''

کہا جا سکتا ہے کہ ان مضامین کے بعد خورشید صاحب ایک طرح مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کا پی۔ایچ۔ڈی۔ مقالہ ''غالب، ابتدائی دور'' اپنے محدود موضوع کی وجہ سے بہت کم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا۔ بابائے اردو نے خورشید صاحب کی انشا پردازی کا بطور خاص ذکر کیا تھا اور یہی بات بنیادی تھی، مولانا آزاد والی بات بنیادی نہ تھی۔ خورشید صاحب کی تنقید درحقیقت انشا پردازی ہی پر استوار تھی۔ اس میں ایسی باتیں زیادہ تھیں جو ایک غیر معمولی طور پر طباع لیکن نوجوان ذہن کو سوجھتی ہیں۔ لیکن باتوں کی چمک دمک ان کے معنی کی

طرف ذہن کو مبذول نہیں ہونے دیتی۔ مندرجہ ذیل پر غور کیجیے:

"حالی ہمیشہ بوڑھے رہے لیکن ان کی محبت ہمیشہ جوان رہی۔"

"شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔"

"سرسید نے زمانے کے سامنے سپر ڈال دی اور جیت گئے۔"

"[امراؤ جان اور اس کے بھائی کی ملاقات کے بیان میں] امراؤ جان کی پچھلی زندگی کا سارا خون کھنچ آیا ہے۔"

"ان (ناسخ) پر سب سے اچھی تنقید آتش کا دیوان ہے۔"

یہ جملے اردو تنقید کی تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں، لیکن خورشید صاحب کا ارشاد اس سے زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ رالف رسل کے ساتھ مل کر انھوں نے Three Mughal Poets لکھی۔ پھر رالف رسل کے ساتھ مل کر غالب پر تین کتابوں کا منصوبہ تھا، لیکن ایک ہی کتاب Ghalib, Life and Letters مکمل ہو سکی۔ کاش کہ تینوں ہی پوری ہو جاتیں۔ رالف رسل نے نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ اردو غزل کے بارے میں مجھے جو بھی معلوم ہے وہ سب خورشید صاحب کی دین ہے، ورنہ اردو خوب سمجھ سکنے کے باوجود غزل میرے لیے بند کتاب کی طرح تھی۔ افسوس کہ علم کی وہ کتاب ہی اب بند ہوگئی جس کا نام خورشید الاسلام تھا۔ رہے نام اللہ کا۔

29-C, Hastings Road
Civil Lines, Allahabad (U.P.)

❑❑❑

حالی

مصنفہ: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

عبدالرب

سوانحی اشارے

نام: خورشید الاسلام
ولادت: 21 جولائی 1919، امری کلاں، مراد آباد۔
والد: شیخ اختر جمیل
شادی: 1947، شریک حیات۔ مسعودہ خاتون
اولاد: چار بیٹے، دو بیٹیاں
تعلیم: ابتدائی تعلیم۔ فتح پوری مسلم ہائی اسکول، دہلی۔
1942: بی۔اے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
1945: ایم۔اے۔
1953: پی۔ایچ۔ڈی۔

ملازمت:

بی۔اے۔ کرنے کے بعد رسالہ ماہنامہ "آج کل" کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے لیکن ایک سال کے بعد علی گڑھ واپس آ گئے۔

1946: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر مقرر ہوئے۔

1953: اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن، درس و تدریس کے سلسلے میں تشریف لے گئے اور تین سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دے کر واپس علی گڑھ آ گئے۔

1959: شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے۔

1968: ہارورڈ یونیورسٹی کی فیلوشپ پر لندن میں اپنی مشہور کتاب "غالب لائف اینڈ لیٹرس" مکمل کی نیز "تھری مغل پوئٹس" بھی اسی زمانے میں منظر عام پر آئی۔

1973: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے اور اسی سال پروفیسر آل احمد سرور کے سبکدوش ہونے پر صدر شعبہ ہوئے۔

1970: آکسفورڈ یونیورسٹی کی دعوت پر آکسفورڈ بھی گئے جہاں آپ نے اردو انگلش ڈکشنری کی ادارت کا کام مکمل کیا۔

1979: سبکدوش ہونے والے تھے کہ مدت ملازمت میں توسیع ہوئی اور 1981 میں مستعفی ہوئے۔

ان ذمہ داریوں کے علاوہ پروفیسر خورشید الاسلام نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موقر رسالے "فکر و نظر" کی ادارت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔

تصنیفات و تالیفات:

شاعری: "رگ جاں" (نظمیں، غزلیں) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس 1961

اس مجموعے کا پیش لفظ مجنوں گورکھپوری نے لکھا۔

"شاخ نہال غم" اردو گھر، علی گڑھ 1975

"جستہ جستہ" (نظمیں) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی 1977

تحقیق و تنقید:

1. "تنقیدیں" انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1957

اس کتاب میں 12 مضامین شامل ہیں جو بقول مصنف 1945 اور 1953 کے درمیان لکھے گئے۔ یہ تمام مضامین اردو کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اور ان میں سے کئی بے حد بحث انگیز ثابت ہوئے۔

2. "غالب۔ ابتدائی دور" انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1960۔

اس کتاب میں غالب کے ابتدائی دور (تقریباً 25 سال کی عمر تک) کی شاعری، متداول اور غیر متداول کلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر فارسی شعرا شوکت بخاری، مرزا جلال اسیر، بیدل، غنی کاشمیری، ناصر علی اور ناسخ کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ بعد کی اشاعت میں کتاب کا نام بدل کر "غالب، تقلید اور اجتہاد" کر دیا گیا۔

3. "غالب لائف اینڈ لیٹرس" — 1968۔
4. اردو انگلش ڈکشنری — 1970۔
5. محمد طفیل (مدیر "نقوش" لاہور) نے "ادارۂ فروغ اردو" سے مرزا ہادی رسوا کا ناول شائع کیا جس میں خورشید صاحب کا مضمون "امراؤ جان ادا" بطور مقدمہ شامل تھا۔
6. کلام سودا اور قائم کے انتخابات بھی مرتب کیے۔
7. "اردو ادب آزادی کے بعد"

اعزازات:

ہارورڈ یونیورسٹی کی فیلوشپ پر آپ نے لندن جا کر وقیع علمی کارنامے انجام دیے۔ آکسفورڈ کی دعوت پر وہاں جا کر اردو انگلش ڈکشنری ایڈٹ کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جنرل ایجوکیشن سینٹر کے پہلے کوآرڈینیٹر مقرر ہوئے۔

پروفیسر خورشید الاسلام کی وقیع علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مندرجۂ ذیل انعامات و اعزازات پیش کیے گئے جن میں چند اہم یہ ہیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ
دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی ایوارڈ
غالب ایوارڈ۔

□□□

خورشید الاسلام

غزلیں، نظم، قطعات

غزلیں

کبھی گلوں کبھی خاروں کے درمیاں گزری
صبا چمن سے بہ ظاہر تو شادماں گزری

اسی کا نام ازل ہے، اسی کا نام ابد
وہ ایک رات جو پھولوں کے درمیاں گزری

کہیں لپک اٹھے شعلے، کہیں مہک اٹھے گل
شب فراق، نہ پوچھو، کہاں کہاں گزری

بہ شکل قامت آدم، بہ طرز رقص پری
ہمارے سر پہ قیامت بھی کیا جواں گزری

کبھی کبھی تو غم دل کی لے بڑھی اتنی
دل حیات کی دھڑکن بھی، کچھ گراں گزری

نہ جانے کتنے نشیب و فراز راہ میں تھے
مگر یہ عمر دو روزہ رواں دواں گزری

بہم رہے ہیں سرو سینہ یک دگر کیا کیا
کہ سر پہ تیغ پڑی دل سے جب سناں گزری

○

دل ہوا ویراں، متاع چشم نم جاتی رہی
رفتہ رفتہ شورش طبع الم جاتی رہی

تجھ پہ کیا گزری کہ پاس عاشقاں کرنے لگا
یعنی ہم پر وہ تری مشق ستم جاتی رہی

ہم کو دنیا سے شکایت ہے کچھ اس انداز کی
تھی کبھی دنیا کو جیسے قدر غم، جاتی رہی

میکدہ ہے، رند ہیں، ساقی ہے، دور جام ہے
بزم جم باقی ہے اب تک، شان جم جاتی رہی

رہ گیا سینہ میں غم، آثار غم ظاہر نہیں
غمگساروں سے بھی اب، چشم کرم جاتی رہی

جس کو کہتے ہیں محبت، ہوگئی اب رسم غیر
جس کو کہتے ہیں مروت، بیش و کم جاتی رہی

○

دل میں جب بھی کبھی دنیا سے ملال آتا ہے
کتنے ہی زہرہ جبینوں کا خیال آتا ہے

شمع جلتی ہے تو پروانوں کا آتا ہے خیال
اور بجھتی ہے تو بجھنے پہ ملال آتا ہے

نوک ہر خار نظر آتی ہے کیوں تشنۂ خوں
دشت پر خار میں کیا کوئی غزال آتا ہے

عین ہجراں میں بھی ملتی ہے کبھی لذت وصل
عین لذت میں بھی لذت پہ زوال آتا ہے

○

روٹھے ہوؤں کو اپنے منانے چلے تھے ہم
بگڑی ہوئی تھی بات، بنانے چلے تھے ہم

کیا کہیے آسمان تھا وہ یا زمین تھی
جس پر گلوں کا نقش بٹھانے چلے تھے ہم

دیکھا انھیں قریب سے ہم نے تو رو دیے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

دنیا کے ناز دیکھ کے حیران رہ گئے
گویا اسی کے ناز اٹھانے چلے تھے ہم

ویرانیوں نے بڑھ کے گلے سے لگا لیا
لے کر دلوں میں کیسے خزانے چلے تھے ہم

دیکھا جو آپ، اپنے لیے غیر ہو گئے
غیروں کو آئینہ تو دکھانے چلے تھے ہم

○

باغِ جہاں کے سادہ جمالوں سے عشق ہے
سبزہ سے، گل سے، سرو سے، لالوں سے عشق ہے

ہاں خار و خس سے دل کو علاقہ ہے پاس کا
ہاں اس چمن کے تازہ نہالوں سے عشق ہے

جو باہنر ہیں ان کے قدم چومتے ہیں ہم
جو بے ہنر ہیں ان کے کمالوں سے عشق ہے

بوڑھوں کے پارہ پارہ عزائم کا ہے ملال
بچوں کے تازہ تازہ سوالوں سے عشق ہے

ہر بے نوا فقیر کو دیتے ہیں خون دل
ہر خوش نوا فقیر کے نالوں سے عشق ہے

سارے جہاں کے تلخ نواؤں سے ہے نیاز
سارے جہاں کے شیریں مقالوں سے عشق ہے

یاں کفر و دیں کے جاننے والوں سے کیا غرض
یاں کفر و دیں کے ماننے والوں سے عشق ہے

○

مجبوری (نظم)

کیوں فسوں کارِ زمانے کے فسوں یاد کروں
کس لیے شہر کے ویرانوں کو آباد کروں
اپنا غم کم ہے جو اوروں کے الم یاد کروں

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

عیش پرویز کی بیداد رہے گی کب تک
کاہش محنت فرہاد رہے گی کب تک
درد میں ہمت فریاد رہے گی کب تک

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

غم بہلتا ہے جہاں روز سر جام شراب
عین مستی میں گورا ہے وہاں نام ثواب
کس نے مانگا ہے جو مانگے کا زمانے سے حساب

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

ہاں تصور میں وہ اگلے سحر و شام نہیں
اس کی نظروں میں بھی فریاد ہے پیغام نہیں
دیر ویران ہے، میخانہ میں اک جام نہیں

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

غم کے شعلوں سے پگھل جائیں گے مینا و ایاغ
بجھ کے رہ جائیں گے اک روز ستاروں کے چراغ
آخر آخر، نہ یہ غنچے ہیں، نہ گل ہیں، نہ یہ باغ

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

ہو جو منظور، تو یاں کعبہ میں اصنام بھی ہیں
شہر یاروں کی نگاہوں میں ابھی دام بھی ہیں
زاویے بھی ہیں، ترانے بھی ہیں، پیغام بھی ہیں

دل میں رہ رہ کے یہ بے کار خیال آتے ہیں

○

قطعات

ہر قطرۂ نیساں کو صدف بھی نہیں ملتی
ہر سینے پہ قرآن بھی نازل نہیں ہوتا
آتی ہے اسی موج سے دریا میں روانی
جس موج کی تقدیر میں ساحل نہیں ہوتا

○

داغ ڈھل گئے اب تو درد میں کمی سی ہے
زندگی نہ جانے کیوں، پھر بھی اجنبی سی ہے
کل جس آبگینے سے موج مے چھلکتی تھی
آج اس آبگینے کی آنکھ میں نمی سی ہے

□□□

خورشید الاسلام

خطوط نگاری

خط لکھنا ایک فن ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے لیکن ان میں کمال حاصل کرنے کے لیے کسی فن کی ضرورت نہیں۔ فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے کچھ اصول ہیں، کچھ ضابطے ہیں، لیکن محبت کرنے کے لیے نہ علم سینہ درکار ہے نہ علم سفینہ، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ خط لکھنے کے لیے صرف قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے تو نہ خط لکھنے پر حرف آتا ہے اور نہ خط لکھنے والوں پر۔ کاغذ اور قلم، صرف کاغذ اور قلم ہی تو نہیں ان میں خون جگر بھی شامل ہے اور جہاں یہ ہو وہاں بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے، لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں۔ ستارے، چاند اور سورج خود بنتے، سنورتے اور غروب ہو جاتے ہیں۔

رزمیہ تصنیف کرنے کے لیے موکلوں کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ نظم لکھنے کے لیے جذبہ، فکر اور موسیقی کی مفاہمت درکار ہے۔ ناول میں زمین کی حرکت اور اس کی پرچھائیوں کو سمونا پڑتا ہے۔ گویا ان ادبی کارناموں میں ہم وجود سے کام لے کر ایک نئے وجود کی تخلیق کرتے اور دنیا کو خیال کی گرفت میں لاکر، نیا رنگ اور نیا ڈھنگ بخش دیتے ہیں لیکن عدم سے وجود میں لانے کا کام ''نہیں'' کو ''ہاں'' میں بدل ڈالنا ''کچھ نہیں'' سے ''کچھ تو ہے'' کا معجزہ دکھانا خطوط نگاری کا کمال ہے۔ ذہن میں کوئی خیال ہو یا نہ ہو، خط لکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح بات چیت کے لیے کسی موضوع کا نہ ہونا، اس کے ہونے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، اسی طرح خط میں، نہ اصول کی ضرورت ہے نہ خیال کی اور نہ موضوع کی۔ زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ زندگی کا نہ آغاز نہ انجام، ایک بہاؤ ہے، ایک روانی ہے، ایک اپج ہے۔ خط میں نہ ابتدا نہ انتہا نہ وسط نہ تکمیل، نہ تشبیب نہ دعائیہ۔ بس گریز ہی گریز ہے اور ہزاروں سال کے تجربے نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ گریز ہی میں زندگی کا حسن ہے کیونکہ زندگی خود ایک گریز ہے۔

زندہ رہنے کے لیے اور خط لکھنے کے لیے زندگی کا احترام ضروری ہے۔ زندگی سے میری مراد ہے اونچی نیچی سڑکیں، چھوٹی بڑی دوکانیں، جیٹھ کی دھوپ، برسات کی اندھیری، بھیانک، مچل جانے والی راتیں، قہوہ خانے، کالج جاڑوں میں نظریں بچا بچا کر مسکرانے والے پھول، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پرانی چیزوں کا نیا پن، سادگی میں بناوٹ، نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں، پندار کی تہہ میں انکسار، آدھا اودل، علم الکلام اور سنگر مشین۔

زندگی میں کھو جانا، زندگی پر قابو پا لینا اور زندگی کو معاف کر دینا ایک بات ہے۔ جو شخص اس حسین آگ سے گزر چکا ہو، اسے حق ہے کہ وہ اپنی سوانح عمری اپنے قلم سے لکھے۔ یہ سوانح عمری قل ھو اللہ کی تفسیر میں ہو یا خطوں میں۔ البتہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خطوں میں قل ھو اللہ کی تفسیر نہیں ہوتی۔ خط حسنِ اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامہ ہوتے ہیں اور ان کے لکھنے کے لیے ادبی فیل پا کے مرض میں مبتلا ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں دنیا کا لطف ہے زندگی میں لمحے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان لمحوں کو زندگی کے دامن سے چرا لینا، محفوظ رکھنا اور رازداروں میں تقسیم کر دینا، یہی حسن عمل ہے، یہی تخلیق ہے اور یہی نجات ہے۔ ہاں تو وہ خطوط جن میں استدلال کا زور ہو، فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں، بلا ارادہ فن کاری ہو، خطوط نہیں ہوتے۔ خطوں میں مرزا بیدل کے اشعار کی گنجائش ہے لیکن ان کی ماورائیت پر مدلل بحث کی گنجائش نہیں۔ آپ خطوں میں رو سکتے ہیں، قہقہے لگا سکتے ہیں، لیکن اخلاقاً، مصلحتاً اور قانوناً، نہ شوپنہار کی قنوطیت پر وعظ کہنے کی اجازت آپ کو دی جا سکتی ہے اور نہ قہقہوں پر مضمون لکھنے کا موقع آپ کو حاصل ہے۔ دنیا کے سارے خط ایک جملہ سے شروع ہوتے ہیں اور ایک جملہ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ جملہ بہت مختصر بھی ہے اور بے کنار بھی ہے۔ ''ہم اور تم انسان ہیں'' اس ایک جملہ میں انسانیت بھی ہے اور خط لکھنے کے اصول بھی ہیں، مفہوم بھی یہی ہے، ساز و سامان بھی یہی ہے اور نشانہ بھی یہی ہے۔

ناول یا افسانہ لکھتے وقت فن کار کے ذہن میں سامعین ہوتے ہیں۔ خط لکھتے وقت دماغ میں نہ غول بیابانی ہوتا ہے نہ کوئی محفل۔ ایک باتیں کرنے والا ہوتا ہے اور ایک باتیں سننے والا۔ اس عمل میں صرف دو انسانوں کی خودی بیدار ہوتی ہے۔ صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں ان کے علاوہ ساری دنیا غنودگی کے عالم میں ہوتی ہے۔ ''مس کی محفل کو دیکھیں ہم تم ہیں خود اک محفل۔'' بس اسی معصوم گناہ میں خطوں کی کامیابی کا راز مضمر ہے اور یہی سبب ہے کہ انسان کے وہ سبک دلکش اور نازک پہلو، جو اس کے بلند ادبی کارناموں

میں ظاہر نہیں ہوتے، خطوں میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ خطوں میں ہمارے لیے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لیے اپنے دوستوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ انسان کی سب سے بڑی خواہش خود کو نمایاں کرنا، ظاہر کرنا یا منظر عام پر لانا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خواہش دراصل اپنے آپ کو چھپانا ہے۔ جس طرح فن کی خوبی فن کے چھپانے میں ہے اسی طرح انسان کا کمال خود کو چھپانے میں ہے۔ ریاضی کے مسئلے ایمان کی نفاستیں، افسانوں کی پرچھائیاں یہ سب پردے ہیں۔ اس لیے اگر آپ اپنے ہمسایہ کی سرگوشیاں تک سننا چاہیں تو اس کے کارناموں کے بجائے اس کے خطوں کا روحانی سفر کیجیے۔ یہ نسخہ سہل ہے۔ خطوں میں آپ حکومتوں کا زوال دیکھیں گے، ان میں بیمار بعض اوقات تندرست معلوم ہوں گے، غم پسند خوش نظر آئیں گے۔ جنھوں نے میدان سر کیے ہیں، ان میں نسائیت ملے گی۔ مردم بیزاروں میں نرمی، نزاکت اور خلوص کی آنچ محسوس ہوگی۔ گلاب کے تختے مصنوعی معلوم ہوں گے اور بید مجنوں پر بہار نظر آئے گی اور کہیں کہیں وہی پایئے گا جو جانتے ہیں جو دیکھا ہے جو سنا ہے۔ جن خطوں میں انسان نے اپنے اوپر قابو پالیا ہو، جہاں وہ خود ہو، جہاں آپ اس کے رازدار بن سکیں، جہاں آپ اس کے گدگدیاں کریں اور وہ مچل جائے، وہیں فتح ہے۔ وہ خط ادبی کارنامہ ہے جس کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں کی طرح لازوال ہو جائے، جنھیں جنبش قلم نے محفوظ کر لیا ہو۔

خطوں کو نجی ہونا چاہیے، نجی باتوں میں رنگارنگی، دلچسپی، تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ یہ ساری خوبیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ دیکھے اور محسوس کرے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی سے اسلوب بنتا ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں جدت ہوتی ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں وہ بصیرت ہے جو جزو کو کل سے زیادہ حسین بنا دیتی ہے ایک ایسے شخص کو جو ہر بار دیکھتا ہے اور ہر بار سمجھتا ہے۔ یہ مشورہ دینے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنی بات میں پرائی بات بھی شامل ہونی چاہیے۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ نظر سے خاک کیمیا ہو جاتی ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ ایک اچھا مکتوب نگار، ان نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ یہ باتیں ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ نجی باتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن یہ اس معنی میں غیر معمولی ہوتی ہیں کہ انھی کی بدولت ایک فرد، منفرد ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک نظم، اپنے مخصوص لب و لہجہ، مخصوص بحر اور مخصوص الفاظ کی بدولت، ممتاز تجربہ بن جاتی ہے اسی طرح انسان، خاص خاص حماقتوں، انوکھی دلچسپیوں اور غیر شعوری حرکتوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ رنگ بے شمار نہیں ہیں۔ ان رنگوں کی آمیزش میں ستم ظریفی ہے۔ اسی لیے دنیا ایک بھی ہے اور بوقلموں بھی ہے۔ خطوں میں رسمی نیکیوں کا خیال ہوتا ہے، نہ کمزوریوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان کی فضا میں ایک قسم کی پُرسکون "انارکی" ہوتی ہے۔ اسی لیے مکتوب نگار بچوں کی طرح نہ صرف اپنے اوپر اعتماد رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اعتماد کے لائق سمجھتا ہے۔ ان اندازوں میں محصور ہو کر وہ اپنے مخصوص لہجے میں بات کرتا ہے۔ اپنی حماقتوں سے اس طرح لطف اٹھاتا ہے جیسے پرانا شرابی پیالہ کو لبوں سے چھو چھو کر رازدارانہ انداز میں چسکیاں لے رہا ہو۔ یہ ہلکے اور گہرے رنگ، اونچی نیچی سانسیں، بے ارادہ غیر انسانی جذبات کا اظہار، جیسے تیر کمان سے نکل جائے انھی سروں کے نت نئے ملاپ سے شخص شخصی ہو جاتا ہے۔ یہ معمولی باتیں تصویر میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں اور خط و خال کی باریکیاں، ان سے اجاگر ہو جاتی ہیں۔ ہم ایک نظر میں بتا سکتے ہیں۔ یہ سوفٹ ہے، یہ چارلس لیمب ہے، یہ شیلی ہیں، یہ مہدی ہیں، جو ہم سے دور ہونے کے باوجود ہمارے تصور میں جوان ہیں۔ یہ حالی ہیں جو بوڑھے پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے زندگی میں کبھی جوانی کی تمنا بھی نہیں کی۔ یہ غالب ہیں جو ہماری کمزوریوں سے محبت کر سکتے اور اپنی نیکیوں پر بے محابا قہقہہ لگا سکتے ہیں ایسے اچھے مکاتیب بے ارادہ لکھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم ادبی شخصیتیں اچھے خطوط لکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روم کے سائے میں ہوئی۔ ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مرکزوں میں بھی اس نے فروغ پایا ہو لیکن یہ ثابت نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یونان میں یہ شغل نہ عوام میں محبوب ہوا نہ خواص میں۔ شاید اس لیے کہ ان کی شہری ریاستیں، سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر سیاروں میں تبدیل ہو گئی تھیں، ہر ریاست ایک دنیا تھی، معاشرت محدود تھی۔ بت کدوں میں، ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں، لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ دل کے غبار اور سر کے خمار کے لیے راہیں تھیں۔ اپنے سیارہ کے علاوہ، دوسروں کے وجود و عدم ان کے لیے برابر تھا۔ وہاں کے بسنے والوں سے انھیں اتنی ہی دلچسپی تھی یا ہو سکتی تھی جتنی ہمیں فرشتوں سے ہو سکتی ہے۔ فرشتوں سے دوستی کے امکانات کم ہیں اور بفرض محال ہوں بھی تو یہ اندیشہ کیا کم ہے کہ فرشتے مسکراتے بھی ہیں۔ بہر حال اس روایت کے نشو و نما کے لیے شرط ہے، وسیع معاشرت با قاعدہ حکومت، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جاننے کے مواقع، عملی زندگی سے واقفیت ایک ایسی زبان جو دور و نزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو اور جس میں ادبی صلاحیتیں ہوں۔ یہ شرائط پہلی بار رومی معاشرت میں پورے ہوئے۔

روم کی زندگی کی جھلکیاں اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنی ہوں تو سسرو کے مکاتیب میں دیکھیے۔ آپ ان میں سادگی کی تلاش کریں گے تو خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ رومیو کے مکاتیب کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال کے بین بین ہے اس دور میں فن خطابت کے اصول اور بلاغت کے

قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے زندگی بندھے ٹکے قوانین کی پابند تھی۔ اس لیے مکتوب نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا تھا۔ خطوط کی قسمیں تھیں۔ مبارک باد کے خطوط، تنبیہی خطوط، تعزیت کے خطوط، ناصحانہ خطوط جن میں کسی پر ملامت کی جائے اور وہ خطوط جن میں دوسروں کو تشفی دی جائے۔ ان کے علاوہ سرکاری فرمان اور رقعات بھی تھے اور ان سب کے آداب و القاب، مضامین، ابتدا اور انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ القاب و آداب کے بعد، غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا، کے انداز پر گفتگو شروع ہوتی تھی جس میں بلاغت کے سارے زیورات صرف کردیے جاتے تھے۔

انگریزی زبان میں، پندرھویں صدی میں مکاتیب لکھنے کا آغاز ہوا یا یوں کہیے کہ انگلستان میں اس صدی سے قبل جو مکاتیب لکھے گئے وہ لکھنے والوں کے ساتھ دفن ہو گئے۔ اس لیے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کے مکاتیب بیشتر رقعات کی صورت میں ہیں، جن میں الفاظ کا ہجوم قیامت سے کم نہیں...... نشاۃ الثانیہ کے آغاز میں اس فن کے بہت سے امام موجود تھے۔ لیکن یا تو ان کے خطوط، پس یاد کردینے اور معنی، قسم کی مشقیں ہیں یا'' ذرو اس سے جو وقت ہے آنے والا، قسم کے وعظ ہیں۔ ہر ورق سے کفن اور کافور کی بو آتی ہے۔ نجی خطوط میں سوائے نجی باتوں کے سب کچھ مل جاتا ہے۔ ان میں ابدی حقائق کے چہرے سے اس بیدردی کے ساتھ نقاب اٹھایا گیا ہے کہ خطوں کی روح پرواز کرگئی ہے۔ یہ خطوط نمونے کے خطوط ہیں۔

سترھویں صدی میں، پرانے اطالوی مکاتیب کے ترجمے کیے گئے لیکن ان سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا۔ جیمز ہاول جسے انگلستان میں مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، اسی دور کا آدمی ہے۔ لیکن اس کے خطوط میں بھی انھی ادبی نفاستوں کا اہتمام ملتا ہے۔ البتہ جون ہیرنگ ٹن جو ملکہ کے درباریوں میں سے تھا ایک حد تک سادہ اور بے تکلف ہے اور اسی لیے اس کے خطوں میں بلاغت کی چاشنی کم اور زندگی کی چاشنی کافی ہے۔ اس طویل مایوسی کے بعد ہماری ملاقات ایک شاعر سے ہوتی ہے جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دو بار دیوانگی میں مبتلا رہ چکا ہے، تنہائی پسند ہے، اپنے باغ میں پھولوں کی دیکھ بھال، گنگنانا اور خط لکھنا اس کی زندگی کے مشاغل ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے قلم سے نکل کر گیت بن جاتی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اس ادیب کا نام ولیم کوپر ہے۔ اسی دور میں دو اور مکتوب نگار گزرے ہیں۔ ایک مشہور شاعر گرے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ کیمبرج یونیورسٹی کی منزلوں میں گزرا اور جس کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو، اس کی فطری جھجک تھی۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن جو اپنے خاص مذاق کے باعث، خواص کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے اور عوام انھیں اجنبی معلوم ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو شاید اصولی طور پر انسانیت کے تصور سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن افراد سے شیر و شکر ہونا ان کے لیے برزخ میں پہنچ جانے سے کم نہیں ہوتا۔ گرے کے مکاتیب مخصوص دوستوں کے نام ہیں۔ جن سے اس کی طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت جھلکی پڑتی ہے۔ ان دو شاعروں کے علاوہ جن کی شہرت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک دار العلوم کا دستور باقی ہے۔ ایک خاتون ہیں جنھوں نے اپنی بچی کے نام دلچسپ خطوط لکھے ہیں۔ جن میں بچوں کی تربیت کے سلسلے میں قیمتی نکات ملتے ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں وہ تازگی اور ہمہ گیری ہے کہ تھکن کا احساس ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ عورتوں میں خوش رہنے اور خوش کرنے کی صلاحیت مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہی صلاحیت خطوں کی جان ہے۔ شاید اسی لیے یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ خط لکھنا عورتوں کا حصہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے بہترین خطوط خواتین ہی کے قلم سے سرزد ہوئے ہیں۔

مکتوب نگاری چونکہ ادب کی سب سے آسان صنف ہے اس لیے خوب پروان چڑھی۔ آپس کے تعلقات میں جو اس کی اہمیت ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات غلط نہیں ہے کہ اس فن پر کتاب لکھنا معاشرت کے سارے گوشوں کو سمیٹنا ہے۔ بہرصورت ہماری دنیا میں یہی ایک رسم ہے جو عالمگیر ہے۔ رومانی دور میں بھی بعض کامیاب مکتوب نگار پیدا ہوئے۔ چارلس لیمب اپنے مضامین ہی کے لیے مشہور نہیں، اس کے مکاتیب بھی ادب کا سرمایہ ہیں۔ لیمب کی زندگی اور اسلوب میں وہی بات ہے جو گرمیوں کی چاندنی میں ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں ہلکی سی افسردگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب دھیما ہے لیکن اس کی تہوں میں جذبات کی گرم رو ہے۔ اس کی سادگی میں انجیل کی پہیلیوں کا سا رنگ ہے اور وہ رومانیت ہے جو دنیا کو پراسرار بنا دیتی ہے۔ اس کے خطوں میں شہری زندگی تنہائی کے مزے اور محبت کی حکایتیں ہیں۔ زندگی کے وہ لطائف ہیں جو اسپارٹا کے شہری بیان کرسکتے ہیں اور موت کا ذکر اس انداز میں ہے کہ انسانوں سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

چارلس لیمب کے بعد کیٹس، شیلی اور بائرن کے خطوط ہیں۔ سیاست دانوں نقادوں اور مذہبی پیشواؤں کے خطوط ہیں۔ لیکن جو نظر اور ندرت کیٹس کے خطوں میں ہے وہ ان لوگوں کے یہاں کم یاب ہے۔ اپنی محبوبہ کو جو مکاتیب اس نے لکھے ہیں وہ پگھلتی ہوئی برف سے زیادہ حسین ہیں۔ یہ صرف تشبیہ نہیں ہے اس لیے کہ کیٹس ان خطوط میں خود برف کی طرح پگھلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی زندگی عرفی کا تغزل تھی اور وہ وقت سے پہلے سرشار ہو کر عرفی کی طرح جوان مرگیا۔

اس جائزہ سے ہمیں دو تین اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ مکتوب نگاری

باقاعدگی کے ساتھ سسرو کے زمانہ میں شروع ہوئی، بلاغت کے اصولوں نے اس فن کو مبنی کی سادگی سے محروم کر دیا لیکن رفتہ رفتہ غازہ دھلتا گیا۔ انگلستان میں مکتوب نگاری کا آغاز، اطالوی کے ترجموں سے ہوا اور مکاتیب کئی مرحلوں سے گزرے ان میں بہترین مکاتیب ان لوگوں کے ہیں، جن کی زندگی خاص معنی میں علمی زندگی تھی یعنی جو عملی زندگی سے ایک حد تک آشنا تھے۔ لیکن جن کے ذاتی عمل کا دائرہ محدود تھا۔ ان باتوں کے علاوہ دلچسپی کی خاطر یہ بھی یاد رکھیے کہ دنیا کے بہترین خطوط عورتوں اور شاعروں کے مرہون ہیں۔

اس روشنی میں ہمیں اپنے سرمایہ پر نظر ڈالنی ہے۔ ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ ذوق عام تھا۔ لیکن خواص کی ادبی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ رقعات عالمگیری کے علاوہ جو مکاتیب شمالی ہند کے بزرگوں نے لکھے ہیں، وہ اس فارسی میں ہیں جو کانٹے پر تولی جا سکتی ہے۔ غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر، قتیل اور دوسرے ادیبوں کے مکاتیب جو کتابی صورت میں موجود ہیں، مکاتیب نہیں ہیں مبہمات ہیں۔ اس دور کے اعتبار سے یہی انداز تحریر فطری تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارے لیے ان میں دلچسپی کا سامان کم ہے۔ غالب سے پہلے شاید لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے زندگی کو برت کے نہیں دیکھا تھا۔ غالب ذہنی طور پر اپنے پیش رووں سے کہیں زیادہ بیدار تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے وجدان اور فکر کو سمویا۔ ان سے پہلے کی شاعری زیادہ تر احساسات کے اظہار پر مشتمل ہے۔ اس کا واحد سبب ان کا تشکک ہے جس کی لے آخر آخر تجمیعت کے ساز میں گم ہوگئی۔ قطرے پر گہر ہونے تک جو کچھ گزری وہی ان کی شاعری اور خطوط کا موضوع ہے۔ ان باتوں پر زور دینے سے میرا مطلب غالب کی بھرپور زندگی پر زور دینا ہے۔ غالب کی زندگی نہ تو خانوں میں بٹی ہوئی تھی اور نہ روایتی تھی۔ انھوں نے فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی۔ ان کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جو کچھ اپنی روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں وہی شاعری میں ہیں اور وہی اپنے خطوط میں ہیں۔ اس باطنی صداقت کی بدولت اردو شاعری ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر کچھ سے کچھ ہوگئی۔ ان کے مکاتیب، زبان کے ارتقا میں نشان میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ آزاد نے بھی تھوڑے بہت خطوط ترکہ میں چھوڑے لیکن ان میں زندگی کی دلچسپیاں کہیں نہیں ملتیں۔ حالی، شبلی، اکبر اور مہدی کے مکاتیب میں شبلی اور مہدی کے خطوط غنیمت ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ حالی اور شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں کیا نظر آتے ہیں۔ ("تنقیدیں" سے ماخوذ)

□□□

دل کی گیتا

مدون: مخمور سعیدی

شریمد بھگوت گیتا ہندوستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا منظوم گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر مشکل الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشوونما پا کر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

یونانی ادویہ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بجا تشخیص کر سکے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 144 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف نباتات اور میوہ جات سے لے کر حیوانی و معدنی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت -/70 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید امتیاز الدین

شہنائی خاموش ہوگئی

دنیا بھر کے موسیقاروں میں استاد بسم اللہ خاں ہی ایسے فنکار تھے جن کا نام شہنائی کے ساتھ ایسا وابستہ تھا کہ شہنائی اور بسم اللہ خاں ایک دوسرے کے مترادف ہو گئے تھے۔ استاد بسم اللہ خاں سے پہلے شہنائی صرف شادی یا مذہبی موقعوں پر ہی بجایا جانے والا ایک ساز سمجھا جاتا تھا۔ استاد بسم اللہ خاں نے اسے ہماری کلاسیکی موسیقی میں ایک نہایت ممتاز مقام عطا کیا۔ انھوں نے شہنائی میں نئی نئی ترمیمیں کیں، ایسی باریکیاں پیدا کیں کہ شہنائی وادن کو کافی عروج حاصل ہوا۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد خاں صاحب شہنائی کو اپنی سکھی کہنے لگے تھے اور اسے سوتے وقت بھی اپنے سرہانے رکھا کرتے تھے۔ استاد بسم اللہ خاں کو شہنائی کے بعد اگر کسی سے والہانہ اور جذباتی لگاؤ تھا تو وہ تھا ان کا شہر بنارس۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شہر دو الفاظ بنا اور رس سے بنا ہے۔ ان کے ایک امریکی پرستار نے ان سے کہا تھا کہ اگر وہ ہمیشہ کے لیے امریکہ میں مقیم ہو جائیں تو وہ انھیں ہر قسم کی آسائشیں فراہم کر دے گا۔ استاد بسم اللہ خاں صاحب مسکرا کر بولے "میرے لیے وہاں پر گنگا کہاں سے لاؤ گے"……

کسی صحافی نے ایک بار ان سے پوچھا تھا کہ کیا آپ کو تقسیم ہند کے وقت کبھی پاکستان جانے کا خیال آیا تھا۔ بسم اللہ خاں نے جواب دیا کہ خدانخواستہ بھلا میں بنارس چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ علاج کے لیے بھی خاں صاحب نے بنارس چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور اسی شہر آرزو سے 22 اگست 2006 کو آخرت کے لیے رخت سفر باندھا اور اس شان سے رخصت ہوئے کہ پورا بنارس انھیں وداع کرنے آیا۔

بوعلی سینا کو شہنائی کا موجد خیال کیا جاتا ہے اور ابتدا میں اس ساز کو سینائی کہا جاتا تھا بعد میں اسے شہنائی کہا جانے لگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے یہ ساز پونگی رپنگی کہلاتا تھا۔ اس کی آواز کسی بادشاہ کو کرخت گزری اور اس نے اس کا بجانا ممنوع قرار دیا۔ اتفاق سے بادشاہ کا حجام موسیقی میں دخل رکھتا تھا۔ اس نے اسے شہنائی میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح شہ یعنی بادشاہ اور نائی کا مرکب شہنائی ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دو فارسی الفاظ شہ اور نے کا مرکب ہے۔

بیسویں صدی میں استاد بسم اللہ خاں شہنائی کے مسیحا بن کر ابھرے۔

خان صاحب 21 مارچ 1916 کو بہار کے ایک گاؤں ڈمراوں ضلع بکسر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت ان کے ماموں علی بخش ولایتی نے کی جو خود بھی شہنائی بجاتے تھے اور بنارس کے وشوناتھ مندر سے وابستہ تھے۔ بسم اللہ خاں چھ برس کی عمر میں بنارس آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

خاں صاحب کہتے تھے "موسیقی ایک سمندر ہے اور میں اس کے کنارے پر کھڑا ہوں۔" انھوں نے 1930 میں اپنے کیریر کا آغاز کیا اور 75 برس کے طویل عرصے میں دنیا کے کونے کونے کا سفر کیا اور اپنی شہنائی سے سارے عالم کو مسحور کر دیا۔ بسم اللہ خاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ 15 اگست 1947 کو لال قلعہ کی فصیل سے انھوں نے شہنائی بجائی تھی جب ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی تاریخی لال قلعہ سے پہلی بار آزادی کا پرچم لہرایا تھا۔ خاں صاحب ان چند نامور شخصیات میں سے ایک تھے جنھیں پدم شری، پدم بھوشن، پدم وبھوشن اور 2001 میں بھارت رتن کے اعزاز سے نوازے گئے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور شانتی نکیتن نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں بھی پیش کی تھیں۔ لیکن یہ فقیر منش شہنائی نواز بے نیازانہ زندگی گزارتا رہا کیوں کہ وہ خود ہر اعزاز کے لیے اعزاز کی حیثیت رکھتا تھا۔ استاد بسم اللہ خاں کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ انڈیا گیٹ، نئی دہلی پر ایک پروگرام پیش کریں۔ 9 اگست 2006 کی تاریخ اس پروگرام کے لیے مقرر بھی ہو گئی تھی لیکن انھی دنوں خاں صاحب بیمار پڑ گئے اور پھر اچھے نہ ہو سکے۔ وہ اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے مدھینگر میں بھی ایک پروگرام پیش کرنا چاہتے تھے لیکن یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ بسم اللہ خاں صاحب کا آخری پروگرام جون 2006 میں جے پور میں ہوا تھا۔

خاں صاحب کی مالی حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ ایک بوسیدہ سی حویلی میں رہتے تھے اور بنارس کی گلیوں میں رکشا میں گھومتے تھے۔ خاں صاحب کے پانچ بیٹے، تین بیٹیاں اور کئی نواسے، پوتے پوتیاں تھیں۔ بڑے بیٹے کا نام مہتاب حسین ہے۔ ان کا گھر چھیاسٹھ افراد کا آشیانہ تھا۔ کئی بے سہارا لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے خاں صاحب کے گھر آ جاتے تھے۔ ان کے گھر کو لوگ پیار سے بسم اللہ ہوٹل بھی کہتے تھے۔

خاں صاحب کے انتقال کے دن ان کے داماد روتے ہوئے کہنے لگے کہ آج سے بسم اللہ ہوٹل ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ رنج کی بات تو یہ ہے کہ اس دن سے موسیقی کے ایک بیش بہا خزانے کا دروازہ بند ہوگیا۔ غنیمت ہے کہ خاں صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنی اولاد کو شہنائی کی تعلیم دے دی تھی۔ ان کے دو لڑکے نیر حسین (عمر 68 سال) اور ضامن حسین (عمر 58 سال) شہنائی اور سب سے چھوٹے فرزند ناظم حسین طبلہ بجاتے ہیں۔ اتنے بڑے کنبے کی پرورش کرنے کے لیے جتنے وسیع مالی وسائل کی ضرورت تھی وہ بسم اللہ خاں صاحب کو میسر نہ تھے۔ آخری دنوں میں وہ بہت پریشان بھی رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے افراد خانہ میں سے کسی کو پیٹرول پمپ یا گیس کی ایجنسی مل جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی۔

استاد بسم اللہ خاں کم عمر اور نئے فنکاروں کی بہت دل جوئی کرتے تھے۔ جب اے آر رحمن پہلی دفعہ استاد بسم اللہ خاں سے ملے تو خاں صاحب نے بڑی محبت سے پوچھا ''اب تک تم کہاں تھے۔ میں نے بارہا تمھارا نام سنا ہے بلکہ پانچوں نمازوں میں رحمن کا نام لیتا ہوں۔'' لتا منگیشکر ان کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ لتا ان سے پہلی دفعہ 1951 میں ملی تھیں جب کہ بسم اللہ خاں ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکے تھے اور لتا ابھی موسیقی کے کوچے میں نو وارد تھیں۔ خاں صاحب نے انھیں دعائیں دیں اور ان کے تابناک مستقبل کی پیشین گوئی کی۔ ایک مرتبہ لتا کی سالگرہ پر خاں صاحب اچانک ان کے گھر پہنچ گئے۔ اور شہنائی بجا کر مبارک باد دی۔ فلم ''گونج اٹھی شہنائی'' میں لتا جی نے بسم اللہ خاں کی دھن پر دوگانے ''تیرے سُر اور میرے گیت'' اور ''دل کا کھلونا ٹوٹ گیا'' گائے تھے۔

استاد بسم اللہ خاں میں انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک کمپنی ان کے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگانا چاہتی تھی لیکن استاد نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں گرمیوں کی راتیں ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈک میں گزاروں اور میرا پڑوسی رمضان علی اپنی ٹین کی چھت پر پانی چھڑک چھڑک کر گرمی برداشت کرنے کی کوشش میں رات کاٹے۔

کرناٹک سنگیت کے مشہور فنکار ایل سبرامنیم نے لکھا ہے کہ ایک بار خاں صاحب کو انھوں نے کسی کنسرٹ (Concert) میں مدعو کیا اور ان کو اور ان کے دس ساتھی فنکاروں کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھیجنے چاہے لیکن بسم اللہ خاں نے کہا کہ اتنے خرچے کی ضرورت نہیں۔ ہم ٹرین سے آجائیں گے۔ اسی طرح بجائے فائیو اسٹار ہوٹل کے کسی اوسط درجے کے ہوٹل میں ہمارا انتظام کر دینا۔

استاد بسم اللہ خاں پر گوتم گھوش نے ایک ڈاکیومنٹری تیار کی تھی جس کا نام تھا ''سنگ میل سے ملاقات۔'' خاں صاحب نے ابتدا میں صرف 5 دن کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی لیکن بعد میں ان کی دل چسپی اس ڈاکیومنٹری میں اتنی بڑھی کہ اس کے لیے انھوں نے اٹھارہ دن صرف کیے۔

خاں صاحب موت سے ڈرنے والوں میں نہیں تھے۔ انتقال سے ایک دن پہلے بھی وہ اپنے معالجین اور تیمارداروں کی تسلی کے لیے بستر مرگ پر بھی ایک کجری گا رہے تھے جس کا مفہوم تھا ''زندگی فرقت کا گیت ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کی گھڑی آگئی۔''

26 جنوری 1950 کو ملک کا پہلا یوم جمہوریہ تھا پنڈت جواہر لال نہرو کی خواہش تھی کہ استاد بسم اللہ خاں شہنائی بجاتے ہوئے اس جلوس کی قیادت کریں جس میں راجندر پرساد، جواہر لال نہرو اور تمام بڑے بڑے قائدین شریک تھے۔ استاد بسم اللہ خاں آگے آگے شہنائی بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ خاں صاحب نے اس موقع کے لیے وہ دھن چنی تھی جس دھن میں گاتے ہوئے ملاح گنگا میں مسافرین کو لے کر کشتی چلاتے ہیں۔ یہ خاں صاحب کی گنگا، بنارس اور اپنے ملک سے محبت کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ہماری جمہوریت کی کشتی استاد بسم اللہ خاں کی طرب خیز شہنائی کی دھن پر آج بھی رواں دواں ہے۔ خاں صاحب نے اٹل بہاری واجپئی کی وزارت عظمیٰ کے دوران میں پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک پروگرام پیش کیا تھا جو براہ راست نشر ہوا تھا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام اس پروگرام کے مہمان خصوصی تھے۔

ناسک (مہاراشٹر) کی ایک کھلونا بنانے والی کمپنی کے مالک درگا داس ٹھاکر سے خاں صاحب نے پچھلے پچاس برسوں میں کوئی پچاس شہنائیاں بنوائی تھیں۔ ایک مرتبہ ٹھاکر نے انھیں صندل کی تسبیح بھیجی تھی۔ خاں صاحب بہت خوش ہوئے کہ ٹھاکر کو لکھا کہ اس کے ورد سے حاصل ہونے والی آدھی برکتیں تمھاری ہیں۔

91 برس کی عمر کچھ کم نہیں ہوتی۔ آدمی کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ استاد بسم اللہ خاں آخر دم تک فعال رہے۔ آج خاں صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا فن ان کی دل نشین شہنائی کی آواز ہمیشہ ہمارے کانوں میں گونجتی رہے گی۔

''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے''

3-5-805, Hyderguda
Hyderabad-500029 (A.P.)

□□□

عبدالعلیم

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر عبدالعلیم کو زبان کے مسئلے سے بہت دلچسپی تھی اور انھوں نے اس سلسلے میں کئی مضامین لکھے تھے لیکن ان میں سب سے پہلا تو غالباً وہی ہے جو اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون ''قومی آواز'' کے پیش رو ہفت روزہ ''ہندوستان'' میں 1937 میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اہم مضمون جس کا عنوان ''اردو، ہندی، ہندستانی'' تھا انھوں نے 1938 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کلکتہ کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں اس کا ذکر کیا ہے اور سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں اس کی تعریف کی ہے لیکن افسوس یہ مضمون تلاش بسیار کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

اردو ادب، عربی زبان و ادب، اسلامیات، تاریخ، تعلیم، ذریعۂ تعلیم، اردو املا اور اصطلاحات یا نیم اصطلاحات سے انھیں خاص طور سے دلچسپی تھی۔ اور ان سارے ہی موضوعات پر ان کی تحریریں ملتی ہیں۔ ان تحریروں کی ایک بڑی خوبی جرأت اظہار ہے۔ جس کا ذکر کرشن چندر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدت احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اکثر اوقات ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں لیکن اس کی انھیں کوئی پروا نہیں۔ وہ ادیبوں کے مہاتما گاندھی ہیں لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں اور کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری، ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگے تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب ہی کے سپرد ہوگا۔ ان کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ گھبراتے ہیں لیکن اس میں ان کی عظمت ہے۔ اگر اس صفت میں کوئی ان سے ٹکر لے سکتا ہے تو وہ حسرت موہانی ہیں۔''(''پودے'' پہلا ایڈیشن۔ صفحہ 79 تا 81) کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اظہار کے علاوہ علیم صاحب کی تحریریں و تقریریں فکر کی کشادگی، استقامت اور تجزیاتی ذہن کی کارفرمائی کے لیے بھی جانی جاتی ہیں۔ افسوس انھوں نے کم لکھا اور جو لکھا اسے بھی محفوظ رکھنے کی فکر نہ کی۔ زیر نظر مضمون ہمیں جناب عابد سہیل نے فراہم کیا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ہندستان میں جب سے قومی تحریک شروع ہوئی اس وقت سے یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ ہمیں ایک قومی زبان کی ضرورت ہے۔ شروع میں تو اس تحریک میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ حصہ لیتے تھے جو انگریزی جانتے تھے، اس لیے کہ تمام سیاسی کاروبار انگریزی میں ہوتا تھا۔ لیکن جب سے جنتا نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے اس وقت سے قومی زبان پر زور دیا جانے لگا ہے۔ بڑی لڑائی کے بعد جب کانگریس کی کایاپلٹ ہوئی تو اسی کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ہندستان کی قومی زبان ہندستانی ہے اور تمام کاروبار اسی میں ہونا چاہیے۔ مگر ابھی تک اس پر پورا عمل نہیں ہوتا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ بہت سے لوگ ابھی تک اس بات کو دل سے مانتے ہی نہیں کہ ہندستانی کو قومی زبان ہونا چاہیے، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دماغ میں یہ بات رہ رہ کر آتی ہے کہ انگریزی سے ہمارا کام نکل سکتا ہے، لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ڈیڑھ سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی اس وقت ہندستان بھر میں بیس لاکھ سے کچھ اوپر آدمی انگریزی بول سکتے ہیں[1]۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد 12 کروڑ سے زیادہ ہے اور اگر ان لوگوں کو بھی ملا لیا جائے جو تھوڑی بہت ہندوستانی سمجھ لیتے ہیں تو یہ تعداد بیس کروڑ سے اوپر ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ بحث تو فضول ہے کہ ہندستانی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی ہماری قومی زبان بن سکتی ہے۔ لیکن مشکل ایک دوسری آن پڑتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہندستانی کوئی زبان نہیں ہے۔ یہ ایک فرضی نام ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ سیاسی کارکنوں نے ایک ڈھونگ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس

لیے اس سوال سے بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

ہندستانی اصل میں اس علاقے کی زبان ہے جس کو پرانے زمانے میں ہندستان کہتے تھے۔ اس علاقے کی چوحدی یہ ہے "اتر میں ہمالیہ، دکن میں وندھیا، پچھم میں پنجاب اور پورب میں بنگال۔ یہ نام سب سے پہلے گل کرائسٹ نے 1887 کے قریب استعمال کیا تھا۔[2]

ہندستانی کی ابتدا کب سے ہوئی اور کیسے ہوئی؟ یہ سوال بہت کٹھن ہے۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جو جو پراکرتیں مدھیہ دیس میں رائج تھیں، انھی کے میل جول سے یہ زبان بنی ہوگی۔ اس زبان کو وشنودھرم کے بھگتوں سے مدد ملی۔ بھگتی تحریک دراصل برہمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔ یہ عوام کی تحریک تھی اس لیے اس نے عوام کی زبان کو استعمال کیا اور سنسکرت کو چھوڑ دیا۔ راجپوتانہ کے درباری بھاٹ اور کوی بھی یہی زبان استعمال کرتے تھے۔ پرتھوی راج کے زمانے میں اس زبان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ آلھا کھنڈ اور پرتھوی راج راسو اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ آگے چل کر کبیر کے دوہے، تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت اسی زبان میں لکھی گئیں اور اب تک اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ میرابائی نے اسی زبان میں کبتائیں کہیں۔ سکھوں کے آدی گرنتھ کا ایک بڑا حصہ اسی زبان میں ہے جس میں کبیر کی چوپائیاں، گرونانک کے بول اور بابا فرید کے اشعار شامل ہیں۔ اس میں کچھ ایسے بھگتوں کا کلام بھی شامل ہے جن کا کسی دوسری جگہ ذکر نہیں ملتا۔ اکبر کے زمانے میں جہاں اور بہت سی چیزوں نے ترقی کی وہاں ہندستانی زبان بھی بہت پھلی پھولی۔ اکبر کے درباریوں میں راجہ بیربل جو کبھی رائے کہلاتے تھے، عبدالرحیم خانخاناں جن کے دوہے اور کبتیں اب تک زبان پر ہیں اور فیضی ہندوستانی زبان کے بڑے شاعر تھے۔ اس زمانے میں گوکل یعنی متھرا کے آس پاس کرشن کے پجاریوں کا بہت زور تھا اور ولبھ آچاریہ اور وٹھل ناتھ کے آٹھ شاگردوں نے، جو اشٹ چھاپ کہلاتے تھے، اپنے بھجنوں سے بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سے سورداس سب سے مشہور ہے۔[3]

ادبی ہندستانی کی بنیاد برج بھاشا پر رکھی گئی جو آگرہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یہ علاقہ مغل بادشاہوں کا مرکز تھا اور جوں جوں ان کی حکومت بڑھتی گئی ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کا رواج بھی بڑھتا گیا۔ اسی زبان کا ایک نام "اردو زبان" بھی پڑ گیا، اس لیے کہ یہ مغلوں کے فوجی بازاروں کی زبان تھی جس کو اردو یا اردوئے معلی کہتے ہیں۔ لیکن اس زبان کا عام نام اس زمانے میں ہندی تھا، یعنی ہند کی زبان۔ یہ نام ان لوگوں کا رکھا ہوا ہے جو ابھی تک فارسی میں تمام کاروبار کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں جب سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں ہونے لگے تو دونوں ادبوں کا میل ہوا اور ملکی زبان پر فارسی کا اثر بڑھنے لگا۔ اس زبان کی ترقی میں اس وقت زیادہ ہاتھ مسلمانوں کا نہیں تھا کیوں کہ وہ تو فارسی سے اپنا کام نکالتے تھے بلکہ ہندوؤں کا تھا جن میں کائستھ اور کھتری آگے آگے تھے جو درباری ضرورتوں کے لیے فارسی سیکھتے تھے اور اپنی بول چال میں فارسی، عربی الفاظ بے طرح استعمال کرتے تھے۔ یہ زبان شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ دکن بھی پہنچی اور گول کنڈہ اور بیجاپور کے درباروں کی زبان بنی اور وہیں پروان چڑھی۔ شمالی ہندستان کے مسلمان شاعر جب ہندستانی زبان کا استعمال کرتے تھے تو وہ پرانی پراکرتی بحریں بھی استعمال کرتے تھے لیکن جب یہ زبان دکن پہنچی تو وہاں آس پاس دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ شمالی ہند والوں نے، جو وہاں بالکل اجنبی تھے، فارسی بحروں کا استعمال شروع کیا اور فارسی شاعروں کی طرح قصیدے، غزلیں، مرثیے، مثنویاں اور رباعیاں لکھنے لگے۔ ہندی، اردو کا فرق اصل یہیں سے شروع ہوا۔ لیکن یہ فرق صرف نظم میں تھا، نثر میں وہی برج بھاشا کی گریمر (گرامر) قائم رہی اور فارسی ترکیب کے جملے کبھی نہیں استعمال کیے گئے۔ غالباً دکن ہی میں شاعری کی اس نئی زبان کا نام ریختہ پڑا اور ولی نے جو بابائے ریختہ کہلاتا ہے اس کا معیار قائم کیا۔ 1719 میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور حاتم دہلوی نے دہلی کی زبان میں اس کی نقل شروع کی۔ اس طرح دہلی اسکول کی بنیاد پڑی۔ جب دہلی اجڑ گئی اور وہاں کے شاعر لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ اردو کا مرکز بن گیا۔

ہندی نثر کی بنیاد اصل میں انگریزی حکومت شروع ہونے کے بعد پڑی۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب فورٹ ولیم کالج کا انتظام ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے ہندوستانی زبان کے ادیبوں کی ایک جماعت کو اس کام پر لگایا کہ وہ نثر میں کالج کے لیے درسی کتابیں لکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ گلکرسٹ نے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک بہت بڑی غلطی کی جس کا خمیازہ ہم کو نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے گا۔ جو چیز اب تک صرف نظم میں تھی اس کو انھوں نے نثر میں بھی شروع کرا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ سادہ ہندوستانی زبان کو رواج دینے کی کوشش کرتے، انھوں نے ایک طرف تو میر امّن اور افسوس وغیرہ کو ایسی زبان لکھنے پر لگایا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور دوسری طرف للو لال سے ان کے مقابلے میں ایسی زبان لکھوائی جس میں سنسکرت کے شبدوں کی بھرمار ہے۔ یہ تو کیسے کہا جائے کہ انھوں نے جان

بوجھ کر ایسا کیا لیکن ہندی۔ اردو کے جھگڑوں میں بدیسی حکومت کی جو پالیسی رہی ہے اور اب تک ہے اور سیاست میں جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش ایک زمانے سے کی جا رہی ہے اس کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ پہلی کوشش بھی اسی خیال سے تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس وقت سے ہندی اور اردو، جو ہندستانی کی دو شاخیں ہیں، اپنی اپنی راہ لگ گئیں اور آہستہ آہستہ ان میں دوری بڑھتی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل کی اردو سمجھنے کے لیے فارسی اور عربی میں کافی مہارت کی ضرورت ہے اور اسی طرح ہندی کو سمجھنے کے لیے سنسکرت کا عالم ہونا ضروری ہے۔ فورٹ ولیم کالج تو ختم ہو گیا لیکن اس کی روح ابھی تک زندہ ہے۔

کانگریس نے ہندوستانی کا نام تو لے لیا لیکن اس کے لیے کچھ کام نہ کیا۔ کانگریس کے بہت سے کارکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے بھی کا[illegible] کرتا ہیں اور اس کام میں انھوں نے تعصب کو چھوڑا نہیں ہے اور چاہتے ہیں کہ وہ ہندی رائج ہو جائے جو سنسکرت کی غلام ہے۔ اس طرح ہندستان کی ایک بڑی جماعت کو ان لوگوں سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شکایت کرنے والوں میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو خود متعصب ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنانا چاہتے ہیں لیکن جو لوگ قوم پرستی کا دعوا کرتے ہیں ان کا تو یہ فرض ہے کہ وہ ایسی چیز کو اٹھائیں جو ٹھیک ہو۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے قائم ہونے کی خبر سے یہ امید بندھی تھی کہ شاید وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور جب اردو کے ادیب بھی بلائے گئے تو امید اور بڑھی لیکن اس کے پہلے ہی جلسے میں ''ہندی اتھوا ہندستانی'' کی عجیب و غریب اصطلاح ایسی تراشی گئی کہ جھگڑا کم ہونے کی جگہ اور بڑھ گیا اور جو لوگ قریب آ رہے تھے وہ بھی بدک گئے۔

ہندی اور اردو کی اصطلاحیں ہندستانی سے پہلے کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مشترک زبان کے لیے نہیں استعمال کی جا سکتی۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے گلکرسٹ نے ہندوستانی کی اصطلاح نکالی اور وہ چل نکلی۔ ہندی اور اردو اس کی دو شاخیں مانی گئیں۔ ہندی کی تعریف یہ ٹھہری کہ وہ ہندستانی کی وہ قسم ہے جو ناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور جس میں سنسکرت کے شبد بہت ہوتے ہیں اور اردو ہندستانی کی وہ قسم ہے جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں عربی، فارسی کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اصل زبان ہندستانی ہے جو ہندستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو دونوں رسم خط میں آسانی سے لکھی جا سکتی ہے۔ یہ زبان بولی زیادہ جاتی ہے اور لکھی بہت کم جاتی ہے۔ پھر بھی اس میں ادب موجود ہے جس کا ایک نمونہ انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' ہے۔ یہ ابھی تک ادبی زبان نہیں ہے لیکن جو لوگ ایک قومی زبان کے خواب دیکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ ٹھیٹھ ہندستانی کو ادبی زبان کے درجے تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ سنسکرت، عربی، فارسی اور یورپ کی زبانوں کے جو لفظ ہماری زبان پر چڑھ گئے ہیں ان کو اپنی زبان سے نکالنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری، لیکن باہر کی زبانوں کے لفظوں کی بھرمار نہ صرف کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے بلکہ ہمارے ادب کی ترقی کو بھی روکتی ہے۔ ایسی بولی سے فائدہ ہی کیا جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔

ترقی پسند ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس سوال پر غور کریں اور اس کا حل نکالیں۔ سب سے پہلے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہندی اور اردو کے ادیب جہاں تک ممکن ہو آسان زبان لکھنے کی کوشش کریں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کے لیے ہندوستانی زبان میں لفظوں کی کمی نہیں ہے، صرف کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر ہم لوگ اس ادب کا اچھی طرح مطالعہ کریں جو دراصل ہندوستانی زبان میں ہے، تو ہمیں لفظوں کا ایسا خزانہ ملے گا جو ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہوگا۔ برج بھاشا، اودھی اور بہار کی بولیاں جن کی طرف ہم لوگ بالکل توجہ نہیں کرتے، ہماری ضرورتوں کو بہت حد تک پورا کر سکتی ہیں۔ اگر ہم سوچ لیں کہ ہم صرف چند آدمیوں کے لیے نہیں لکھ رہے ہیں جو عربی، فارسی یا سنسکرت جانتے ہیں بلکہ ملک کی عام آبادی کے لیے لکھ رہے ہیں تو ہماری کوشش لازمی طور پر یہ ہوگی کہ ہم آسان زبان لکھیں۔

اس میں شک نہیں کہ علمی مضمونوں کے لیے ہماری زبان میں کافی سرمایہ موجود نہیں ہے اس لیے مجبوراً علمی اصطلاحوں کے لیے اردو لکھنے والوں کو عربی، فارسی اور ہندی لکھنے والوں کو سنسکرت کی طرف جانا پڑتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی دونوں زبانوں کے لکھنے والے ایک بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ نئے علم ہم کو یورپ سے ملے ہیں اور ہم لوگ یورپ کی علمی اصطلاحوں کا عربی یا سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بجائے اس کے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اصل اصطلاحوں کو استعمال کریں اور اگر وہ بہت بھونڈی معلوم ہوں تو ان کے کونے تراش کر ان کو سڈول بنا لیں۔ شروع میں تو یہ اصطلاحیں ضرور بوجھل معلوم ہوں گی لیکن استعمال ہوتے ہوتے کانوں کو بھلی معلوم ہونے لگیں گی۔ ہماری زبان میں کتنے ہی لفظ یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں اور اب کوئی جانتا بھی نہیں کہ وہ بدیسی ہیں۔ اگر کہیں پر نئی اصطلاحیں بنانے کی ضرورت ہی پڑ جائے تو پھر خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اصطلاح بول چال کی زبان سے جہاں تک ہو سکے قریب ہو۔ شروع میں تو یہ اصطلاحیں بہت بے وزن معلوم ہوں گی اور ان میں علمی شان نہ ہوگی

لیکن استعمال ہوتے ہوتے ان میں بھی وہی وزن پیدا ہو جائے گا جو عربی اور سنسکرت کی اصطلاحوں میں ہوتا ہے۔

اصطلاحیں بنانے کا کام بہت کٹھن ہے لیکن اگر چند آدمی ایسے اکٹھے ہو جائیں جن میں کچھ عربی فارسی اچھی طرح جانتے ہوں اور کچھ سنسکرت اور سب کے سب ان علموں کو بھی جانتے ہوں جن کی اصطلاحیں بنانی ہیں اور ان کو اس کام کی دھن ہو تو ایسی اصطلاحیں بن سکتی ہیں جو ہندستانی زبان کی اصطلاحیں کہی جا سکیں۔ ایسے آدمی ہندستان میں مل سکتے ہیں اور کئی آدمی الگ الگ اس کی کوشش بھی کر رہے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ وہ سب لوگ مل کر کام کریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کوئی بڑی انجمن یا سبھا اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اصل میں تو یہ کام "ہندستانی اکیڈمی" کے کرنے کا ہے۔ اس کے پاس سرمایہ ہے اور کوشش کرنے پر اور مل سکتا ہے۔ اب اس کی اتنی ساکھ بھی ہو گئی ہے کہ اگر وہ ہر فن کے عالموں کو جمع کرنا چاہے تو وہ لوگ اس کام کے لیے تیار ہو جائیں گے اور یہ نہ سمجھیں گے کہ اس میں ان کا وقت ضائع ہوگا اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ حیدرآباد میں جو اس قسم کی کوشش ہوئی ہے وہ پورے طور سے کامیاب نہیں ہوئی اس لیے کہ اس میں بہت جلدی سے کام لیا گیا اور صحیح قسم کے آدمیوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ وہاں صرف اردو کی اصطلاحیں بنانے کا خیال تھا اور زیادہ تر عربی فارسی سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستانی زبان کی اصطلاحوں میں سنسکرت کی مدد ضروری ہے۔ اگر "ہندستانی اکیڈمی" سے بالکل نا امیدی ہو جائے تو پھر جو لوگ قومی زبان کی ترقی چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اس کام کے لیے ایک خاص انجمن بنائیں۔ اس لیے کہ جب تک یہ کام نہ ہوگا ہندستان میں ایک قومی زبان نہیں ہو سکتی۔

صوبۂ متحدہ کے ابتدائی مدرسوں میں چوتھے درجے تک ایسی ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں جن کی زبان تو ایک ہوتی ہے لیکن رسم خط ناگری یا فارسی الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ خیال اچھا ہے لیکن اتنا ہی کافی نہیں، اس لیے کہ آگے چل کر لڑکوں کو جو ادبی ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں ان کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں۔ جو چند مشترک الفاظ ان کو یاد ہوتے ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ جو صورت شروع کے چار درجوں میں ہے وہی آگے بھی ہو۔ تعلیم کی باگ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ چاہیں تو یہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ انگریزی مدرسوں میں بھی اب ہائی اسکول تک انگریزی کے سوا سب مضمون مادری زبان میں پڑھائے جاتے ہیں لیکن ابھی تک ان مضمونوں کی کتابیں ہندوستانی زبان میں نہیں ملتیں۔ اگر سررشتۂ تعلیم اس طرف توجہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی کتابیں تھوڑے دنوں میں نہ تیار ہو سکیں۔ ان کتابوں کی زبان مشترک ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک کٹھن سوال رسم خط کا ہے۔ ہندوستانی زبان کے دو ٹکڑے بڑی حد تک صرف اس وجہ سے ہو گئے کہ رسم خط ایک نہیں ہے۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم لوگ اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور اس رسم خط کو اختیار کر لیتے جو ہماری زبان کی آوازوں کو پوری طرح ادا کر سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس سوال نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا ہے۔

رسم خط بدلنے سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اپنے پرانے ادب سے تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ مصطفیٰ کمال نے جو ترکی میں لاطینی رسم خط کو نافذ کرنے کا بیڑا اٹھایا تو انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ پرانا تمدن اور پرانا ادب قومیت کے نئے تخیل کے لیے کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہے۔ وہ تو ایک نئی قوم پیدا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو اپنے ماضی سے کم سے کم تعلق رکھے۔ ایسی حالت میں تبدیلی صرف اس وجہ سے نہیں کی گئی کہ ایک مشکل اور ناموزوں رسم خط کو چھوڑ کر ایک آسان اور موزوں رسم خط اختیار کیا جائے بلکہ غالباً اصل مقصد یہ تھا کہ نئی قوم پرانی روایات کا دامن چھوڑ کر مغرب کے تمدن اور ادب سے ناتا جوڑے۔

ہمارے دیس میں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ ہمارے پرانے تمدن کی جو خوبیاں تھیں وہ تو جاتی رہیں اور جو خرابیاں تھیں انھوں نے اتنی ترقی حاصل کر لی ہے کہ ہماری قومی زندگی کے راستے میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتی ہیں۔ اس مرض کا علاج ان لوگوں کے نزدیک یہی ہے کہ ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑے جو موجودہ زمانے کی علمی ترقی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور جس میں فرقہ پرستی کی گنجائش بالکل نہ رہے۔ اس صورت کے پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہو سکتا ہے کہ رسم خط کو بدل دیا جائے۔ ظاہر ہے اس طرح پرانے ادب اور پرانی روایات سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا اور نئے رسم خط میں وہی کتابیں شائع ہوں گی جن کی ضرورت نئی قوم کو ہوگی۔

حواشی:

1. رپورٹ مردم شماری 1931 جلد اول، صفحہ 372
2. ہندوستانی زبانوں کی پڑتال، ازگریس، جلد 9 حصہ اوّل صفحہ 43
3. ہندوستانی ادب ازسر چارلس لائل۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (چودھواں ایڈیشن)

□□□

حبیب الرحمٰن چغتائی

اردو زبان اور روزگار کے مواقع

یوں تو فراہمی روزگار ازخود ایک مسئلہ ہے لیکن جب اردو بولنے والی اقلیت کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی پریشان کن نظر آتا ہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد سے یہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت اور بھی شدت اختیار کرلیتا ہے جب اردو زبان کے فروغ اور روزگار کو لازم وملزوم سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایک مکتبۂ فکر یہ ہے کہ جب تک اردو زبان کو روزی روٹی سے نہیں جوڑا جائے گا وہ ترقی نہیں کرسکتی۔ اس میں کسی حد تک سچائی نظر آتی ہے تاہم یہ کلیتاً درست نہیں۔ اگر ہم ترقی یافتہ زبانوں کا جائزہ لیں تو کافی حد تک دونوں میں باہمی تعلق نظر آتا ہے۔ بہر کیف فروغ اردو تحصیل روزگار کے لیے کوئی ضمانت نہیں۔

اردو ایک مشترکہ قومی زبان ہے۔ یہ ہماری تہذیب وثقافت کی شناخت ہے۔ یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت ہے۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مسلمانوں کی خدمات اپنی جگہ مگر اردو کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے میں ہندوؤں کی کاوشیں کچھ کم نہیں۔ مسلمانوں ہی کی طرح ہندو حضرات نے بھی حضورؐ اقدس کی سیرت پاک کو والہانہ انداز میں نعتیہ گل ہائے عقیدت و ارادت نذر کیے ہیں۔ پھر بھی تنگ نظروں نے اسے محض مسلمانوں کی زبان کہہ کر مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جب کہ کوتاہ بینوں نے صرف قلبی واردات اور دلی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ جان کر اسے لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ کورچشم اس کے دامن کی تنگی کا شکوہ کر بیٹھے۔ اردو زبان ان تمام الزامات سے مبرا ہے۔ یہ صرف ادبی نہیں علمی زبان بھی ہے۔ شعروشاعری اس کی حد نہیں۔ یہ رموز کائنات، بنائے موجودات اور ادق سے ادق سائنسی موضوعات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دارالترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے سائنس، میڈیسن اور ٹیکنالوجی کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرکے اس دعوے کو ثابت کر دکھایا۔ کیا مخالفین اردو کو علم نہیں کہ سرسید نے 1863 میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد غازی پور میں اسی غرض سے رکھی تھی کہ یورپی تصانیف کو اردو زبان سے آراستہ کیا جائے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو انجمنیں اور اکادمیاں اردو تراجم کرانے میں مصروف ہیں۔ یہ کتابیں قصے کہانیوں کی نہیں، درسی اور سائنسی تصانیف ہیں۔ متعصب بھی اس کی علمی حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے دامن کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ کبھی دوسری زبانوں کے الفاظ کسی تبدیلی کے بغیر اس میں سماجاتے ہیں تو کبھی یہ ان کی ہیئت بدل کر ایک نیا روپ دے دیتی ہے۔ یہ تغیر پذیر ہے اور دور جدید سے مطابقت کی پوری استعداد رکھتی ہے۔

ماہر لسانیات جوشوافش مین زبان کے بارے میں رقم طراز ہے ''زبان محض تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں، نہ ہی مختلف خیالات، احساسات، نظریات کی خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا واضح ترجمان ہوتی ہے۔ بلکہ زبان خود ایک مکمل مواد کی حیثیت رکھتی ہے، باقاعدہ طور پر سماج کی عکاس ہوتی ہے اور عوام کی معاشرتی حیثیت اور تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ زبان کے ذریعے مختلف حالات وموضوعات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتی ہیں۔'' یہ جملہ صفات اردو زبان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ یہ زوال پذیر ہے۔ یہ حقیقت ہے یا ایک مفروضہ؟ آیئے ذرا اس پر گہرائی سے غور کرتے ہیں۔

جہاں تک بول چال والی اردو کا تعلق ہے اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ یہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ اتنی شیریں ودلکش، شگفتہ وشستہ ہے کہ ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے۔ ذرائع ابلاغ بالخصوص برقیاتی ذرائع ابلاغ نے اردو کو مقبول عام کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سنیما اور ٹی. وی. نے اردو کو گھر گھر پہنچا دیا ہے۔ نوے فیصد سے زیادہ فلمیں اردو میں بنتی ہیں مگر ہٹ دھرمی کا عالم ہے کہ انھیں سرٹیفکیٹ ہندی کا دیا جاتا ہے اور اردو والے ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی صدائے احتجاج ہے نہ کوئی مظاہرہ۔ ان نادانوں سے کوئی پوچھے کہ یہ اوچھی حرکتیں کیا ہندی کو ہر دل عزیز بنا سکتی ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو سرٹیفکیٹ کو بغور دیکھتے ہیں۔ عوام تو گانوں کے بولوں اور مکالموں سے متاثر ہوتے ہیں جو خالص اردو زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کے قبول عام میں ہمارا کوئی رول نہیں۔ یہ تو اردو کی حلاوت ہے جو ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ وہ صرف ہندوستان اور ایشیائی ملکوں میں ہی نہیں بلکہ سات سمندر پار دور دراز علاقوں میں بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اب رہا معاملہ تحریری اردو کا تو واقعی یہ مسائل سے دوچار ہے۔ اردو رسم خط کو نشانہ بنانا گویا ایک فیشن ہوگیا ہے۔ بعض نادان دوست بلکہ دوست نما دشمن دیوناگری لپی کو اختیار کرنے کی وکالت بڑی شدومد سے کرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ دیوناگری لپی میں وہ استعداد نہیں جو اردو الفاظ کا صحیح املا

اور تلفظ ادا کر سکے۔ محض اس غرض سے کہ اس کے پڑھنے والوں میں اضافہ ہو جائے گا اس کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر دیا جائے یہ تو ظلم ہوگا۔ اگر اس کے روئے زیبا میں کشش ہے تو پروانے خود بخود ادھر آئیں گے۔ زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ رسم خط سے تعلق نہ ٹوٹے۔ جسم و جان کی جدائی موت کی علامت ہے۔ اردو کے وجود کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے ہی رسم خط کے قالب میں رہے۔

آزادی کے بعد سے سیاسی منظرنامے میں جو تبدیلی آئی اس نے اقلیتوں خاص کر مسلمانوں اور اردو زبان کو اپنا نشانہ بنایا۔ انھیں آئینی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ دستوری ضمانت محض کاغذ کی زینت بن کر رہ گئی۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام کا بیشتر علمی سرمایہ اردو زبان میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں کا اس سے جذباتی لگاؤ ہونا ایک فطری بات ہے۔ صرف اسی بنیاد پر اردو کو محض مسلمانوں کی زبان کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ یوں تو ہندو دیومالائی اساطیر کا وافر ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔ تو کیا اسے ہندوؤں کی زبان کہنا درست ہوگا؟ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ یہاں کی رنگارنگی اور بوقلمونی اس کا خاصہ ہے۔ اس کی حفاظت دونوں قوموں کی ذمہ داری ہے۔ نفرت و نفاق نے اردو کو بہانہ بنا کر ہنگامہ آرائی کر رکھی ہے۔ سیاسی مقصد برآری کے لیے تصادم کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ہمیں اسی ماحول اور فضا میں رہتے ہوئے اردو کے تحفظ و ترقی کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔

مدارس کی یہ خدمات قابل ستائش ہیں کہ وہ مخالفتوں کی تند و تیز ہواؤں میں اردو کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ لیکن محض ان کی یہ کوششیں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ناکافی ہیں۔ جب تک اسے مستحکم بنیاد حاصل نہیں ہوگی اس کی نشو و نما ممکن نہیں۔ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونا چاہیے۔ آئین ہند بھی اس کی ضمانت دیتا ہے۔ ہمارا کام اس کا نفاذ کرانا ہے۔ ریاستی حکومتوں پر سیاسی دباؤ ڈالنا ہوگا کہ اردو بولنے والی آبادیوں کے لیے اسکولوں میں ابتدائی درجات میں مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ نیز ثانوی درجوں میں سہ لسانی فارمولہ رو بہ عمل لایا جائے۔ دستور کی روشنی میں نئے اسکولوں کا قیام بھی ضروری ہے۔ بلاشبہ یہ کام آسان نہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہمارا مستقل استحصال کیا جا رہا ہے، جھوٹے وعدے کیے جاتے ہیں، سبز باغ دکھائے جاتے ہیں، کھلونے دے کر بہلایا جاتا ہے لیکن مسئلہ اپنی جگہ قائم ہے۔ آئین میں دی ہوئی رعایتوں کو عمل میں نہیں لایا جاتا۔ ہمیں جمہوری طریقہ کار اپنانا ہوگا۔ اپنے ووٹ کی طاقت کا استعمال کرنا ہوگا۔ سیاسی جماعتوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ ان کی قسمتوں کے فیصلے رائے دہندگان کے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرح آزادیِ وطن کے لیے مل کر تحریک شروع کی تھی بالکل اسی طرح اپنے وطن میں اردو کو اس کا کھویا وقار و مرتبہ دلانے کے لیے ایک پرعزم مہم کا آغاز کرنا ہوگا۔ اس جدوجہد میں تمام ہم خیالوں، رضاکار تنظیموں اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہم وطنوں کو شامل کرنا ہوگا۔ ماضی کے تمام تلخ تجربوں اور جھوٹے وعدوں سے سبق حاصل کرنا ہوگا تاکہ انجام اردو کی دستخطی تحریک جیسا نہ ہو۔

تقریباً چار پانچ سال پہلے حکومت نے سروشکشا ابھیان منظور کیا ہے۔ اس کی مدت 2010 تک ہے۔ اس اسکیم سے مجوزہ طریقہ کار کے مطابق ہمیں بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو اس ابھیان کے تحت نئے اسکولوں کے قیام اور قائم شدہ اسکولوں میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں اردو تعلیم کو رائج کرانے میں اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ محض حکومت سے امید کرنا اور اس پر پوری طرح تکیہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے، اگر ہم اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں خود بھی کچھ کرنا ہوگا۔ ہمیں خود بھی نجی اسکول قایم کرنے ہوں گے۔ اگر ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اردو زبان سے نابلد نہ رہیں تو یہ کام ہمیں کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ کل کا مورخ ہمیں اپنی کوتاہیوں کے لیے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

پہلے تعلیم کا خاصا زور اخلاقیات، سماجی اقدار اور کردار سازی پر ہوا کرتا تھا۔ ذہن و شعور کو جلا بخشنا، حق و باطل کے فرق کو سمجھانا اور معاشرے کی برائیوں کو دور کرنا تعلیم کے مقاصد اول میں تھا۔ مگر آج کے ترقی یافتہ دور میں تعلیم کا تصور ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ اب وہ ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ مادہ پرستی زندگی پر غالب آتی جا رہی ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات کا دور دورہ ہے۔ ایسے میں بے چاری اردو جو پہلے بھی روزگار کی دسترس سے دور تھی، آج اور زیادہ مشکلوں کا سامنا کر رہی ہے۔ دیگر علوم بھی کچھ کم متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ وہاں بھی حصول روزگار بہت دشوار ہو گیا ہے۔ روزگار مرکوز تعلیم کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو اردو والوں کی معاش کا معاملہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اسے معیشت سے جوڑا جائے۔

کسی بھی زندہ زبان کی یہ پہچان ہے کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت سے معمور ہوتی ہے۔ آج دنیا میں انفارمیشن ٹکنالوجی نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اس کا دخل نہ ہو۔ اگر اردو زبان جدید کاری کی گوناگوں سہولتوں سے تہی داماں رہتی تو جلد ہی دم توڑتی نظر آتی۔ اردو زبان کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں برصغیر میں جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ اردو کے

تابناک مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس نے زبان کی ترقی کی راہیں ہموار کی ہیں اور روزگار کی نئی جہات پیدا کر دی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک سرکاری ادارہ ہے جو 1996 میں اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس کو نوڈل ایجنسی بنا کر اس کے دائرۂ عمل کو اور بھی وسیع کر دیا گیا۔ قومی سطح پر اقلیت کو اردو تنظیموں سے نٹ ورکنگ کے ذریعے باخبر رکھنا تاکہ سرکار کی وضع کردہ نئی نئی پالیسیوں سے استفادہ کیا جا سکے، اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ ابتداءً اس کا بجٹ صرف چوراسی لاکھ تھا جو اب بڑھ کر چودہ کروڑ ہو گیا ہے۔ گویا سرمایے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ عزم وارادے اور دور رسی نے اردو کی ترقی کے لیے ماحول خوب سازگار بنا دیا ہے۔ قومی کونسل نے اب تک جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ذیل کے سطور میں ملاحظہ کیجیے۔

عالم کاری اور جدید کاری کے اس دور میں قومی اردو کونسل نے اردو کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑ کر وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ یہ اردو کے فروغ میں تو معاون ہوگا ہی معاش کی نئی راہیں بھی وا کرے گا۔ 1996 میں ''کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی.'' کا ایک سالہ ڈپلوما کورس جاری کیا۔ ملک کے طول وعرض میں اب تک 206 کمپیوٹر سینٹر قایم کیے جا چکے ہیں۔ اب تک 29913 افراد یہاں سے سند حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے 60% لوگوں کو روزگار مل گیا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس میں 40% مسلم لڑکیاں ہیں۔ یہ اعداد وشمار خاصے مؤثر ہیں تاہم یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو اقلیت کو پوری طرح بیدار کرنے میں مزید توجہ وتشہیر کی ضرورت ہے۔

کمپیوٹر کے استعمال نے کمپوزنگ، تصحیح اور حذف واضافے کی غیر معمولی آسانیاں فراہم کر دیں۔ لیکن اس کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ کاتبوں سے ان کی روزی چھین لی۔ جب حصول نان شبینہ اور روزینہ ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تو ایسے میں قومی اردو کونسل نے ایک بڑا ہی مستحسن قدم اٹھایا۔ ''کیلی گرافی گرافک ڈیزائن'' میں دو سالہ تربیتی کورس شروع کیا۔ اس نے کاتبوں کے لیے مختلف میدانوں میں قسمت آزمائی کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مائل بہ زوال خطاطی کے عروج کے لیے بھی روشن امکانات پیدا کر دیے۔ خطاطی ہماری میراث ہے۔ اسلام نے اسے فن مصوری کے مقام تک پہنچا دیا۔ یہ ہماری تہذیب کا مظہر ہے۔ اس کے تحفظ وترقی کے لیے جو بھی اقدامات کیے جائیں وہ لائق ستائش ہیں۔ قومی اردو کونسل نے اور بھی اہم اور مفید کام انجام دیے ہیں۔ منزل سب کی ایک ہے یعنی اردو زبان کی نشو ونما اور معاش کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔

اردو ٹائپسٹوں اور اسٹینو گرافروں کی کم مانگ کے پیش نظر اردو، ہندی اور انگریزی میں ایک سہ لسانی ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کورس شروع کر کے کونسل نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح کثیر لسانی تکنیکی انسانی وسائل پیدا کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔

قومی کونسل نے اردو رسم خط کی بقا کے لیے ہندی اور انگریزی میں ایک مراسلاتی کورس بھی شروع کیا ہے تاکہ ہندی اور انگریزی کے واقف کار اردو کو اس کے اپنے رسم خط میں پڑھ لکھ سکیں۔ عربی اور فارسی زبانوں کی ترویج واشاعت کے لیے مدارس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ کونسل نے سماجی اور سائنسی علوم کی کتابیں تیار کرا کے مدارس میں بہم پہنچائی ہیں نیز ان کی مالی معاونت بھی کی ہے۔ اب تک اس کام پر لاکھوں روپے صرف کیے جا چکے ہیں۔ ''فنکشنل عربک'' میں دو سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ہے تاکہ روزگار کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکیں۔

کتنے لوگ ہیں جو کتابوں کا انتخاب کتابیات کے ذریعے کرتے ہیں، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ پہلے کتابوں کی ورق گردانی کی جائے پھر انھیں خریدا جائے۔ قومی کونسل نے کتاب میلے لگا کر اس خواہش اور ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ کونسل نے اپنی مطبوعات کے کشتی کتابخانے جگہ جگہ روانہ کیے ہیں جو کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح قومی اردو کونسل کی مطبوعات تک رسائی آسان ہو گئی ہے۔ ان سب کاموں میں رضاکار تنظیموں نے اپنا بھرپور تعاون دیا ہے۔ ان کاموں نے اردو حلقوں میں ایک شعور بیدار کیا ہے جو اردو کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ اب تک میں نے قومی اردو کونسل کی ان خدمات کا مختصراً ذکر کیا ہے جو وہ انجام دے رہی ہے۔ اب کچھ ایسے کاموں کا ذکر مقصود ہے جو اردو کونسل کی توجہ کے محتاج ومستحق ہیں۔

1. جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تقریباً تین چار دہائی پہلے غالباً ترقی اردو بیورو نے اردو کتابیات کی تدوین شروع کرائی تھی۔ بعض ناگزیر وجوہ سے اس میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی لہٰذا اسے روک دیا گیا۔ اگر قومی کونسل ہندوستان میں دستیاب اردو مطبوعات کی ایک مکمل کتابیات تیار کرا دے تو اردو دنیا پر بڑا احسان ہوگا۔ بعد میں اسی کی بنیاد پر موضوعی فہرستیں بھی مدون کی جا سکتی ہیں۔ عالمی سطح پر فیض رسانی کے لیے اسے انٹرنیٹ پر فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے تحقیقی کاموں میں بے پناہ آسانی ہو جائے گی۔ اگر ان تصانیف کی محتویات کو Digitise کر دیا جائے تو دوہرا فائدہ ہوگا۔ ایک تو اردو کا علمی سرمایہ محفوظ ہو جائے گا اور دوسرے کتابخانوں کی خاک چھانے بغیر گھر بیٹھے تحقیقی کام کیے جا سکیں گے۔ جہاں تک مخطوطات کا تعلق ہے ایک ''قومی مشن برائے مخطوطات'' قایم کر دیا گیا ہے جو پورے ملک میں خطی ذخیروں کی نشاندہی اور فہرست سازی میں مصروف ہے۔
2. اگر اردو کو ترقی یافتہ زبانوں کے زمرے میں شامل کرنا ہے تو عالمی ادب کو اردو میں اور اردو کی اہم تصانیف کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا ہوگا۔ قومی

کونسل کو چاہیے کہ ''ترجمہ نگاری'' میں ایک ڈپلوما کورس شروع کرے۔ اس وقت اردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں کی سخت قلت ہے۔ لوگ ترجمہ کم اور ترجمانی زیادہ کرتے ہیں مگر نام ترجمے کا ہی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں دیکھا گیا ہے کہ اصل متن ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سہل پسند حضرات اصل ماخذ سے رجوع کرنے کی بجائے ثانوی مصادر پر تکیہ کر لیتے ہیں اور اصل مصنف کے افکار و آرا میں تصرف ہو جاتا ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، کونسل کو ادھر توجہ دینی چاہیے۔

3. ترجمے کے لیے اچھی اور مستند ذولسانی لغات کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے مگر تکنیکی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے میں مصطلحات کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ اکثر مصطلحات نہیں مل پاتی ہیں اور مترجم خود طبع آزمائی کرتا ہے۔ ترقی اردو بیورو نے وضع اصطلاحات میں ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اب نئے نئے موضوعات وجود میں آ گئے ہیں۔ ان کی اصطلاحات کے مرادفات اردو میں وضع کیے جانے چاہئیں۔ یہ کام اردو کونسل ہی کرا سکتی ہے۔

4. کتابخانوں میں ایسے ایسے نایاب اور اہم مخطوطات موجود ہیں جن تک محققین کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ اگر ان کی تدوین کرا کے منظر عام پر لایا جائے تو نئے نئے انکشافات سامنے آ سکتے ہیں۔ اس وقت باصلاحیت انسانی وسائل کا قحط ہے اور یہ کام اتنا بڑا اور مشکل ہے کہ چند لائق نفوس کی موجودگی سمندر میں قطرے کی مانند ہے۔ لہٰذا ایڈیٹنگ میں ایک ڈپلوما کورس شروع کیا جائے جہاں تجربہ کار حضرات باصلاحیت نوآموزوں کی تربیت کریں اور ان کو اپنی خصوصی توجہ سے اس قابل بنائیں کہ وہ اردو، فارسی اور عربی کے منتخب مخطوطات کی تدوین کر سکیں۔

5. ایک مسئلہ اہم ہونے کے باوجود ہنوز تغافل کا شکار ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ برصغیر میں اردو، فارسی اور عربی کے بے شمار ذخائر موجود ہیں۔ ان سے مستفید ہونا تو کجا ان کے بارے میں کوئی علم بھی نہیں ہے۔ جن کے بارے میں ہم معلومات تو رکھتے ہیں لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے کہ ان سے استفادہ ممکن بھی نہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ وہاں کوئی کتابیاتی نظم و ضبط (Bibliographic Control) نہیں ہے۔ کوئی درجہ بندی ہے نہ فہرست سازی۔ کتابیں بے ترتیب اور منتشر ہیں۔ اس صورت میں مطلوبہ کتاب تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ مالی وسائل کی کمی کے علاوہ اہم سبب یہ ہے کہ تربیت یافتہ افراد دستیاب نہیں جو اس کام کو کر سکیں۔ جب کبھی مشرقی کتابخانے اسامیاں مشتہر کرتے ہیں (ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو مطلوبہ استعداد کے حامل افراد نہیں مل پاتے ہیں۔ ہر مشرقی کتابخانہ اس مسئلے سے دوچار ہے مگر افسوس آج تک اس کے تدارک کی کوئی جامع کوشش نہیں کی گئی۔ اس وقت جو نصابیات لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے شعبوں میں رائج ہیں وہ اس ضرورت کو پورا نہیں کر پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کام یہ کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی کتابخانوں کے جملہ امور سے متعلق ایک سرٹیفکٹ یا ڈپلوما کورس شروع کیا جائے تاکہ مطلوبہ انسانی وسائل پیدا کیے جا سکیں۔ یہ کام تو ہو سکتا ہے لیکن ان کی کھپت کہاں ہوگی یہ مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ مشرقی کتابخانوں یا بڑے کتابخانوں کے مشرقی شعبوں میں اسامیاں ہوتی ہی کم ہیں جب کہ ضرورت زیادہ اسٹاف کی ہوتی ہے۔ جب تک روزگار کی ضمانت نہیں ہوگی لوگ کتابداری کے اس نصاب کی طرف مائل ہی نہیں ہوں گے۔ اتنی ہی مدت کا کمپیوٹر اپلی کیشن کورس کر لیا جائے تو روزگار کے بہت سے مواقع مل سکتے ہیں۔ تو کیا مشرقی کتابخانوں کو ان کی اسی حالت پر رہنے دیا جائے؟ علم کے یہ سرچشمے جو بڑی مشکل سے وجود میں آئے تھے، ان کو تباہ و برباد ہونے دیا جائے اور ہم اپنی بے بسی کا ماتم کرتے رہیں؟ علم کے ان خزینوں کی حفاظت ہر حال میں ہمارا فریضہ ہے۔ یہ سوچنا ہوگا کہ کتابداری کا یہ کورس کرنے کے بعد لوگ بے کار نہ رہیں۔ کونسل ماہرین علم کتابخانہ اور مشرقی کتابخانوں کے سربراہوں سے اس موضوع پر بسط و تفصیل سے مذاکرہ کرے اور تمام جزئیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی سفارشات حکومت ہند کو پیش کرے۔ یونیورسٹیاں بھی اس مسئلے پر غور کر سکتی ہیں۔

6. قومی اردو کونسل ناشرین و مصنفین کے مالی مصارف کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ان سے تھوک میں کتاب خریدتی ہے۔ ان کتابوں کو ان عوامی کتابخانوں کو مفت فراہم کرے جن کے مالی وسائل محدود ہیں اس طرح وہ بھی نئی نئی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن، کولکاتا ہر سال لاکھوں روپے کی کتابیں خریدتی ہے اور ملک بھر میں عوامی کتابخانوں کو تقسیم کرتی ہے۔ قومی اردو کونسل جب یہ کام کرے گی تو اردو زبان اور اردو والوں کو بہت فائدہ ہوگا۔[1]

اردو زبان کی جب تک مضبوط بنیاد نہیں ہوگی اس میں استحکام نہیں آ سکتا۔ یہ استحکام اسی وقت ممکن ہے جب اردو زبان کو ابتدائی اور ثانوی درجوں میں داخل کر دیا جائے۔ قومی کونسل کو اسے نافذ کرانے میں اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔

1. قومی اردو کونسل کتابوں کی تھوک خریداری اسکیم کے تحت خریدی گئی کتابیں ملک کی مختلف لائبریریوں میں مفت تقسیم کرتی ہے۔ (ادارہ)

Hareem Millat Road
Dodhpur, Civil Lines
Aligarh-202002 (U.P.)

□□□

عبدالباری مسعود

برطانیہ میں اردو کی صورت حال

برطانیہ کا لسانی نقشہ تبدیل ہورہا ہے۔ یہ انکشاف برطانیہ ہی کے ایک خودمختار لسانی ادارے The National Centre for Languages نے اپنے ایک لسانی جائزے میں کیا ہے۔ اس کے مطابق ملک کے کثیرنسلی اور لسانی معاشرے میں مادری زبانیں سیکھنے کے رجحان میں تبدیلی آئی ہے۔ یعنی انگریزی کے علاوہ دوسری زبانیں جاننے اور سیکھنے کا ذوق پروان چڑھ رہا ہے (جنھیں وہاں اصطلاحاً کمیونٹی لینگویج کہا جاتا ہے) گزشتہ برس جن چالیس ہزار طلبہ نے کسی کمیونٹی لینگویج میں لیاقت حاصل کی ہے ان میں اردو زبان سرفہرست ہے اور ان طلبہ کی تعداد چھ ہزار سے زائد تھی۔ علاوہ ازیں جائزے میں اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوا ہے کہ دیگر طبقات بھی اردو زبان سیکھنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

یوں تو سات سمندر پار اردو کی نئی بستیوں میں برطانیہ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے جہاں آج اردو زبان نے ثانوی تعلیمی اداروں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے دیگر یورپی زبانوں جرمن، فرانسیسی، ڈچ، اطالوی اور پرتگیزی کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت تسلیم کروالی ہے۔ نیز امتحانات میں بھی اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر اختیار کیے جانے کے مواقع حاصل ہیں۔ اتنا ہی نہیں اب لندن یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ اور پی ایچ ڈی تک اردو کی تعلیم کا بھی انتظام ہے علاوہ ازیں عالمی لینگویج سینٹروں میں بھی اردو کی تعلیم کا خاصا بہتر انتظام ہے۔

جائزے کے مطابق برطانیہ کی تین ریاستوں یعنی انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں 61 غیرسرکاری زبانوں (Community Languages) کی تعلیم کا انتظام ہے جب کہ سرکاری اور غیر سرکاری پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں 19 مختلف غیرسرکاری زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ زبانیں یا تو نصاب کا حصہ ہیں یا ان کی تعلیم اسکول کے خالی اوقات میں دینے کا بندوبست ہے۔ گزشتہ برس جن 40 ہزار طلبہ نے اپنی مادری زبانوں میں لیاقت حاصل کی ان میں اردو کے بعد چینی، عربی، ترکی اور آئرش زبانوں کے طلبہ کی تعداد قابل ذکر رہی۔ جائزہ ٹیم کی سربراہ جونا میک پیک (Jonna McPacke) نے جو اسٹرلنگ یونیورسٹی میں لسانیات کی استاد ہیں، ایک ملاقات میں بتایا کہ مختلف قومیتوں کے تارکین وطن کے باعث برطانیہ کا معاشرہ ایک کثیرلسانی معاشرہ ہے۔ جہاں انگریزی کے علاوہ دیگر زبانیں سیکھنے کا رجحان نہ صرف شہری علاقوں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی پھیل رہا ہے۔ تاہم جونا پیک نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ملک کے متعدد تعلیمی ادارے اب بھی ایسے ہیں جہاں طلبہ کی تعلیمی ترقی میں دو یا سہ لسانیات کی افادیت کا احساس اتنا قوی نہیں ہے۔

سروے کے نتائج میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ 21 ویں صدی میں کون کون سی زبانیں برطانیہ کے لیے تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی میدانوں نیز بین الاقوامی تعلقات میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ لسانی ماہرین نے اس فہرست میں اردو، ترکی، چینی، بنگالی اور عربی زبانوں کو شامل کیا ہے جو برطانیہ کی مہاجر آبادی میں سب سے زیادہ بولی جانے والی اور سب سے زیادہ پڑھائی جانے والی زبانیں ہیں۔

لینگویجز سینٹر کی ڈائرکٹر ازبیلا مور (Isbella Moore) نے برطانیہ کے لسانی منظرنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے راقم کو بتایا کہ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کے بچوں کی بالترتیب دس فی صد اور نو فی صد تعداد گھر پر کوئی اور زبان (یعنی مادری زبان) بولتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سینٹر ایسے بچوں کو ان کی مادری زبان سکھانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ جس نے ہر کمیونٹی لینگویج کا ایک نصاب تیار کیا ہے۔ چونکہ سینٹر کے قیام کا مقصد ہی برطانیہ کے لسانی تنوع میں اضافہ کرنا اور کمیونٹی لینگویجز کی منظم انداز میں ترویج و اشاعت ہے۔

لندن کے اسکولوں میں زیر تعلیم ساڑھے آٹھ لاکھ بچوں کے ایک جائزے میں یہ دلچسپ نکتہ سامنے آیا کہ ڈھائی لاکھ بچے غیر انگریزی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے گھروں میں اپنی مادری زبانوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی کمیونٹی زبانوں کی تعداد 300 تھی۔ ان زبانوں کے بولنے والوں میں اردو بولنے والے طلبہ کی تعداد بنگالی، گجراتی اور پنجابی کے بعد چوتھے نمبر پر تھی جو تقریباً 26 ہزار ہے۔ چونکہ پنجابی اردو زبان سے بہت قریب ہے، نیز پاکستان کی پنجابی زبان کا رسم الخط بھی اردو ہے اس لحاظ سے اردو بولنے والے طلبہ کی تعداد انگریزی کے بعد دوسرے نمبر پر لکھی جا

سکتی ہے۔

سرکاری طور پر ایسے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں کہ جن سے مختلف لسانی گروہوں کی تعداد کا پتہ چل سکے۔ برطانیہ میں آباد 30 لاکھ سے زائد تارکین وطن ایسے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں کی قومی زبان انگریزی نہیں ہے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد برصغیر ہند و پاک کے تارکین وطن کی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد 20 تا 22 لاکھ ہے اور ان کی اکثریت برصغیر سے تعلق رکھتی ہے اور ان کی مادری یا رابطے کی زبان اردو ہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں انگریزی کے بعد اردو بولنے والوں کو دوسرا بڑا لسانی گروہ گردانا جاتا ہے۔ ایک دور تھا جب یہاں اردو محض بولی کی حیثیت سے زندہ تھی اور نئی نسل اردو سے ناآشنا ہوتی جا رہی تھی اور عملاً انگریزی ان کی مادری زبان کی جگہ لے رہی تھی۔ اس وقت حالات کس قدر مایوس کن تھے اس کی عکاسی ایک مثال سے ہوتی ہے۔ سلطان محمود برطانیہ میں مقیم اردو کے ایک صحافی ہیں جنھوں نے یہاں کے مختلف شہروں میں آباد دانشوروں، ڈاکٹروں، انجینئروں، اساتذہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کے چھ سے سولہ سال کی عمر کے ایک سو بچوں کی اردو دانی کا جائزہ لیا تھا جس کے نہایت مایوس کن نتائج برآمد ہوئے۔ 42 طلبہ ایسے تھے جو اردو سے بالکل ناآشنا تھے اور واقعی انگریزی ان کی مادری زبان تھی۔ انھوں نے بتایا کہ جب ایک دس سالہ پاکستانی بچی فوزیہ سے اردو کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے بلا کسی جھجک کے بتایا کہ اردو ایک خوبصورت اور چھوٹے سے گاؤں کا نام ہے جو پاکستان میں واقع ہے۔ اس بچی کے والدین ڈاکٹر ہیں۔

غالباً اس صورت حال کی ایک وجہ یہ رہی کہ ابتدا میں برصغیر کے جو تارکین وطن یہاں آباد ہوئے، ان کو دو طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ آج تارکین وطن کی دوسری نسل میں مادری زبان کی اہمیت کے تئیں احساس شدید ہو رہا ہے اور وہ اردو دانی کی جانب متوجہ ہو رہی ہے۔ سرکاری اور کمیونٹی کی سطح پر بھی اردو کی تعلیم کا انتظام اب ملک کے تقریباً ہر حصے میں ہے۔

برطانیہ کے علاوہ یورپ کے دیگر ملکوں جیسے فرانس، ہالینڈ، جرمنی وغیرہ میں بھی اردو بولنے والے آباد ہیں لیکن ان ملکوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی نظام موجود نہیں جیسا کہ برطانیہ میں ہے۔ ویسے ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو کے حوالے سے برطانیہ اور برصغیر کے درمیان تاریخی رشتے رہے ہیں۔ یہ بات تاریخ میں مذکور ہے کہ بنگال کے پہلے گورنر کا تقرر اردو سے واقفیت کی وجہ سے ہوا تھا۔ خود ملکۂ وکٹوریہ نے بھی ایک مسلم معلم سے اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔

آج برطانیہ میں اردو کا منظر نامہ بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت نیز ایک ٹی.وی. چینل کے قیام نے اردو کو وہاں ایک مستند زبان کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے بعد برطانیہ اردو صحافت و ادب کا تیسرا بڑا مرکز بن گیا ہے۔

بی.بی.سی. ریڈیو کی عالمی اردو سروس، اس کی اردو ویب سائٹ کے علاوہ آج لندن سے دو روزنامے ''نیشن'' اور ''جنگ'' شائع ہو رہے ہیں جو ذولسانی یعنی اردو اور انگریزی میں ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی اور شہروں جیسے برمنگھم، مانچسٹر، لیڈس، سلاؤ اور بریڈفورڈ وغیرہ سے بھی کئی چھوٹے بڑے اخبارات و جرائد نکل رہے ہیں۔ ''برطانیہ میں اردو صحافت'' کے مصنف اور صحافی سلطان محمود کے بقول برصغیر ہند کی آزادی سے قبل برطانیہ میں کسی باقاعدہ اردو اخبار کا سراغ نہیں ملتا۔ ہر چند کہ 1920 میں کچھ ہندوستانی طالب علموں نے 'ہند' نام سے ایک چھوٹا سا اخبار جاری کیا تھا جس میں گاہے بگاہے اردو کا ایک آدھ صفحہ ہوتا تھا۔ بہر حال 8 اپریل 1961 کو برطانیہ میں سب سے پہلا اردو کا اخبار ''مشرق'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں کئی ہفت روزہ اخبارات، ماہنامے اور روزنامے منظر عام پر آئے۔ ان میں ایشیا، آفاق، اخبار وطن، گھرانہ، آزاد، عوام، المشتہر، راوی اور روزنامہ ملت قابل ذکر ہیں لیکن یہ اخبارات مختلف وجوہ کی بنا پر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکے۔ 1971 میں پاکستان کے سب سے بڑے روزنامہ ''جنگ'' نے اپنا لندن ایڈیشن شروع کیا جو مختلف نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد آج پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی بالخصوص کمپیوٹر کی آمد سے اردو اخبارات کی اشاعت میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی عملی مثال ''جنگ'' کا لندن ایڈیشن ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے جس میں اردو کے آٹھ اور انگریزی کے چار صفحات ہوتے ہیں۔ یہ اخبار مکمل طور پر سوائے چند مقامی خبروں کے کراچی سے انٹرنیٹ کے ذریعے تیار ہو کر آتا ہے۔ یہاں صرف اس کی طباعت عمل میں آتی ہے۔ لندن ''جنگ'' کے انچارج افتخار قیصر نے بتایا کہ ادارتی اور انتظامی شعبے میں نصف درجن افراد کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اخبار کا ایک پورا صفحہ لندن اور برطانیہ کے دیگر حصوں کی خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

چند سال قبل لندن ہی سے روزنامہ ''نیشن'' کی اشاعت عمل میں آئی

جو خالصتاً ایک برطانوی اخبار ہے۔ اخبار کے مدیر اور مالک محمد سرور نے تحریر کیا کہ برطانیہ میں اردو کی صورت حال میں بہتری آئی ہے۔ انھوں نے ذولسانی اخبار کو برطانوی معاشرے کی ضرورت قرار دیا۔ اس سے نئی نسل کو بھی اپنے آبائی ملک کی صورت حال اور مسلمانوں کے حالات سے باخبر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ چونکہ برطانیہ کے قومی میڈیا میں ایسی خبروں کو جگہ نہیں مل پاتی ہے۔ پندرہ روزہ ''آتش'' کے مدیر اے۔ مجید قریشی نے کہا کہ برطانیہ میں گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد اردو اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔

انگریزی اخبارات جیسے ٹائمز، ٹیلی گراف، گارجین عالمی حیثیت کے حامل اخبارات کے مقابلے میں اردو اخبارات صحافت و مواد کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں لیکن قیمت کے اعتبار سے دوگنا۔ اس کی اصل وجہ سرکاری سرپرستی سے محرومی اور مالی وسائل کی کمی ہے۔ اس کے باوجود وہ برطانوی معاشرے میں اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص گیارہ ستمبر کے واقعے اور سات جولائی کے بعد سے حکومتی حلقوں میں بھی اردو پریس کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ اس وقت جو قابل ذکر اخبارات اشاعت پذیر ہیں ان میں ''آتش''، ''آئینہ''، ''فرینڈس'' اور ''نوائے وقت'' شامل ہیں۔

صنعتی شہر مانچسٹر سے ڈی.ایم. ڈیجیٹل کے نام سے اردو کا ایک سٹ لائٹ چینل شروع ہوا ہے۔ یہ 24 گھنٹوں کا چینل خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں کے علاوہ تفریحی، تعلیمی اور ثقافتی پروگرام بھی نشر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں کئی مقامی ٹی وی چینلوں پر بھی اردو میں مذہبی اور دیگر تفریحی پروگرام نشر ہو رہے ہیں جو برطانیہ میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے مظہر ہیں۔

آج اردو برطانیہ کے ہر حصے میں پہنچ چکی ہے۔ راقم کو جن شہروں میں جانے کا موقع ملا وہاں تارکین وطن کے علاقوں کے بازاروں، دکانوں، مسجدوں اور اسلامی مراکز وغیرہ میں اردو ترسیل کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کے بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں اور تو اور برطانوی پولیس کو بھی اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ وہ وہاں آباد برصغیر کے تارکین وطن کے احساسات اور ان کی تہذیب وتمدن سے واقف ہو سکے۔

لینگویج سینٹر کے سروے میں غیر اردو داں طبقہ کے اردو سیکھنے کے حوالے سے دلچسپ باتیں اس دورے میں سامنے آئیں۔ ان میں کسی دوسری زبان میں استعداد حاصل کرنے کے علاوہ اس زبان کی تاریخ، تہذیب اور مذہب کو جاننے کا جذبہ بھی شامل ہے جب کہ کئی طلبہ کا احساس تھا کہ یہ ان کے کیریئر کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

اردو کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی برطانیہ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ جہاں متعدد چھوٹی بڑی ادبی انجمنیں اردو زبان اور اس کے ادب کی ترویج میں مصروف عمل ہیں۔ لندن، برمنگھم، مانچسٹر وغیرہ کو بین الاقوامی نوعیت کے اردو کے ادبی جلسے کو منعقد کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ مشاعروں، بالخصوص شعری اور ادبی نشستوں نے اردو ادب کی آبیاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لندن سے شائع ہونے والے دو ماہی ادبی جریدے ''اردو تحریک'' کے مدیر ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے راقم کو بتایا کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں برطانیہ میں ذوق شعر و ادب کو پروان چڑھانے میں اولین کردار ان ادبی نشستوں کا ہی رہا ہے۔ چھٹی دہائی کے ابتدائی دور میں نشستوں نے آگے بڑھ کر اردو کا پرچم لہرایا۔ بعد ازاں انجمن ترقی اردو برطانیہ نے اس میدان میں پیش رفت کی۔ اس سے حوصلہ پا کر کئی نئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان نشستوں نے جہاں نومشق شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کی تربیت کی وہیں تخلیقی عمل کی بھی حوصلہ افزائی کی۔

راقم کو اپنے دیگر ساتھی صحافیوں کے ہمراہ لندن کی اردو لٹریری سوسائٹی کے ایک ادبی جلسے میں شرکت کا موقع ملا جس میں کئی شعرا و شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان میں نئی نسل کے کئی شعرا تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کی نئی نسل کو شعر و ادب سے خاصی دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر عزم نے بتایا کہ ان کی انجمن گذشتہ 25 برسوں سے باقاعدگی سے ہر ماہ کے آخری جمعہ کی شام لندن یونیورسٹی میں یہ جلسہ منعقد کرتی آ رہی ہے۔

اردو رسائل و جرائد کی اشاعت، غزل گائیکی کے پروگرام اور ٹی.وی. چینلوں سے اردو پروگراموں کی نشریات نے یہاں اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کے خوشگوار نتائج سامنے آ رہے ہیں اور نئی نسل میں اردو زبان اور ادب کے تئیں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔

بحیثیت مجموعی برطانیہ کے تینوں صوبوں یعنی انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں کمیونٹی لینگویج کو فروغ دینے کے پروگرام کے حوالے سے اردو کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع مل رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب برطانیہ کے محبان اردو پر قنوطیت طاری تھی لیکن اب اردو زبان کی ترقی کے ضمن میں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

Flat No.-9, 3rd Floor
168/2, Jha House
Basti Hazrat Nizamuddin
New Delhi-110013

□□□

علی اصغر

عوامی ذرائع ترسیل اور اردو

انسانی معاشرے کو ارتقائی مراحل کی موجودہ منزل تک پہنچانے میں مشینوں کا اہم کردار رہا ہے۔ مشین کی آمد کے بعد انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں تغیر وتبدیلی کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ یہ صنعتی انقلاب کا دور تھا جس کے تحت نشر واشاعت کے نئے طریقوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ادبی اظہار کے نئے وسائل نے تخلیقی تجربات کے امکانات روشن کیے اور بہت کم وقفے میں زبانی اظہار و بیان کی روایت کو تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ اس مشینی عہد میں ہی تخلیقی تجربات اور ان کے اظہار کے طریقوں کو لے کر غور وفکر کا ایک سلسلہ چلا۔ ترسیل کے بصری اور سمعی ذرائع کی بدولت تخلیقی ادب میں نئے نئے تجربے ہوئے اور اظہار کی سطح پر بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ پریس، فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بالواسطہ ترسیل کے ذرائع بن کر سامنے آئے۔ ان ذرائع نے اردو زبان و ادب کو بھی ایک وسیع دائرہ عطا کیا جس کی بدولت عوام بھی ادبی فن پاروں سے مستفیض ہونے لگے جو کبھی صرف خواص تک محدود تھے۔

پریس کی آمد سے قبل ادبی تخلیقات نقل ورنقل کے عمل تک محدود تھیں۔ ادب عوام کی دسترس سے بڑی حد تک دور تھا۔ اس عہد میں ادب ایک مخصوص طبقے کے ذہن و ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا تھا۔ مگر چھاپہ خانے کی آمد سے اس صورت حال میں تبدیلی آئی اور اس کے ذریعے وسیع پیانے پر کتابوں کی اشاعت ممکن ہوئی۔ قارئین کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ہی ادب کے امکانات کی تلاش شروع ہوئی۔ عام انسان اور اس کی زندگی کی عکاسی پر توجہ دی جانے لگی۔ فوق الفطرت عناصر سے احتراز کیا جانے لگا۔ ناول جیسی صنف کی داغ بیل پڑی اور جاگیردارانہ تہذیب کی پروردہ نثری صنف داستان پیچھے رہ گئی۔

پریس کی توسیع کے ساتھ ہی ترسیل کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت نے عام قارئین تک خبروں اور اطلاعات کی ترسیل کو ممکن بنا دیا۔ مخاطب کی تبدیلی کا اثر نہ صرف خبروں کے مواد پر پڑا بلکہ ترتیب وتدوین کے نئے زاویے بھی سامنے آئے جس سے جدید اردو صحافت کی بنیاد پڑی۔

ریڈیو عوامی ذرائع ترسیل کی ایک نئی اور انوکھی جہت بن کر سامنے آیا۔ اس کے زیر اثر اردو ادب میں بعض نئی اصناف کا اضافہ ہوا مثلاً ریڈیائی ڈراما، ریڈیو اوپیرا، ریڈیائی تقریریں اور ریڈیو فیچر وغیرہ۔ یکم جنوری 1936 کو آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت ریڈیو پر اردو مشاہیر کی زبردست چہل پہل تھی۔ دہلی اسٹیشن اردو ادیبوں، شاعروں، نغمہ نگاروں اور آرٹسٹوں کا مرکز تھا۔ حفیظ جالندھری، پطرس بخاری، عبدالحمید سالک، منٹو، بیدی، کرشن چندر میراجی اور اس دور کے دوسرے کئی مشاہیر نے ریڈیو پر اردو پروگراموں کو غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔ ساغر نظامی، روش صدیقی، بعد میں سلام مچھلی شہری، رفعت سروش، عمیق حنفی، پریم ناتھ در، کمال احمد صدیقی، مظہر امام، رتن سنگھ، اقبال مجید، زبیر رضوی، فیاض رفعت، محمود ہاشمی، جاوید ناصر، محمد علی موج وغیرہ نے اس محکمے میں اہم ذمہ داریاں نبھائیں کچھ لوگ اب بھی یہ ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ریڈیو کے اثرات اردو نثر اور نظم دونوں اسالیب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نظموں میں صوتی آہنگ کا نیا شعور بیدار ہوا اور ڈرامائیت کا عنصر بھی آ شامل ہوا۔ نثری اسلوب میں ڈرامے کو ریڈیو کے ذریعے کافی فروغ ہوا۔ کرشن چندر کا ڈراما 'بیکاری' پہلی دفعہ دہلی سے ریڈیو پر نشر ہوا جس کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ ریڈیو ڈرامے کے ساتھ ہی یکبابی ڈرامے بھی اس عہد میں کافی مقبول ہوئے۔ آج بھی آل انڈیا ریڈیو دہلی اور اس کی علاقائی یونٹیں ریڈیو پر مشاعروں اور ادبی مذاکروں اور دیگر ادبی پروگراموں کا اہتمام کر رہی ہیں جو اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں تو مختلف اصناف سخن نے ریڈیو پر اپنا منفرد مقام بنایا مگر غزل ان تمام اصناف پر حاوی رہی اور ریڈیو پر آج بھی اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج تقریباً ہر ریڈیو اسٹیشن اس صنف کا محتاج ہے۔ مہدی حسن، غلام علی، جگجیت سنگھ، پنکج اداس، فریدہ خانم، عابدہ پروین، چینا ز مسانی کی غزلیں مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر خواہ وہ ایف۔ایم۔ رینبو (F.M. Rainbow) ایف۔ایم گولڈ (F.M. Gold) F.M. 93.5، ریڈیو سٹی، ایف۔ایم۔ 91 یا ریڈیو مرچی F.M. 98.3 ہو ہر جگہ گونج رہی

ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں کئی ایسے ریڈیو اسٹیشن ہیں جو خصوصی طور پر اردو نشریات پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر بی.بی.سی. (اردو)، وائس آف امریکہ (VOA)، وائس آف جرمنی (VOG)، وائس آف اسلامک ریپبلک آف ایران (VOIRI)، چائنا ریڈیو انٹرنیشنل (CRI)، ریڈیو سعودی عربیہ (RSA)، ریڈیو پاکستان اور ریڈیو صدائے حریت وغیرہ۔ جن ریڈیو نشریات کا ذکر عوامی ذرائع ترسیل اور اردو کے حوالے سے مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ان میں سے اکثر و بیشتر ریڈیو اسٹیشنوں کے نشریات انٹرنیٹ پر سن سکتے ہیں، خبریں پڑھ سکتے ہیں اور اپنی رائے بھی اسی ویب سائٹ سے بھیج سکتے ہیں۔

عوامی ذرائع ترسیل کے حوالے سے ٹیلی ویژن بھی جدید عہد کی چیز ہے۔ ابتدا میں تو ٹیلی ویژن پر صرف اردو خبریں ہی نشر ہوا کرتی تھیں مگر دھیرے دھیرے اس نے اردو ڈرامے، سیریل اور فیچر فلموں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ مثال کے طور پر ٹیپو سلطان، الف لیلیٰ، علی بابا چالیس چور، سند باد جہازی، غالب کی حیات و خدمات پر مبنی سیریل مرزا غالب وغیرہ۔ دور درشن پر اردو پروگراموں کے مقبول ہونے کے بعد ہندوستان میں کئی چینل شروع کیے گئے مثال کے طور پر ای ٹی.وی. اردو، کتاب ٹی.وی.، اردو ٹیلی ویژن نیٹ ورک وغیرہ۔ آج ہندوستان، پاکستان، مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک کو ملا کر تقریباً چالیس اردو ٹی.وی. چینل ہیں۔ اب دور درشن اور سہارا ٹی.وی. نے بھی اردو چینل شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ای ٹی.وی. پر نشر ہونے والے پروگراموں میں خاص بات، اداکار، مشاعرہ، غزل سرا، محفل، معمہ، ادبی کوئز، بیت بازی، قوالی اور ڈراما سیریل ''تمھارا انتظار ہے'' وغیرہ کافی مقبول ہیں۔

پاکستان میں ہندوستان کی بہ نسبت زیادہ اردو چینل ہیں جن کی تعداد تقریباً 28 ہے۔ چند اہم نام درج ذیل ہیں۔ رنگ ٹی.وی.، اے ٹی.وی.، جیو ٹی.وی. (Geo TV)، آج ٹی.وی.، اے.آر.وائی. ڈجیٹل ایشیا، کیو ٹی.وی. (QTV)، انڈس پلس (Indus Plus)، بزنس پلس، پی.ای.بی.سی. پاکستان، پی.ٹی.وی.، پی ٹی.وی. ورلڈ، فلمازیا وغیرہ۔ اس کے علاوہ ورلڈ اے.آر.وائی. ڈجیٹل، ویلکم اردو وغیرہ امریکہ اور برطانیہ میں اردو نشریات دیکھنے والوں کے لیے دستیاب ہیں۔

مذکورہ بالا اردو چینلوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کے دائرے کو مزید وسیع کیا ہے۔ ان کی کامیابی کے اثرات غیر اردو چینلوں پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب غیر اردو چینل بھی اپنے پروگراموں میں اردو زبان، فقرے، الفاظ و تراکیب اور شعر و شاعری کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان چینلوں نے نہ صرف اردو پروگراموں میں نئے نئے تجربات کے لیے دروازے کھولے ہیں بلکہ ادب کے موضوعات، طرز بیان اور تکنیک پر بھی ان کے دوررس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

آج جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں اسے ICE age کہتے ہیں۔ I سے مراد انفارمیشن، C سے مراد کمیونکیشن اور E سے مراد انٹرٹینمنٹ ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ معاشرے کو معاشرہ مبنی براطلاعات (Information Based Society) بھی کہتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ آج جن نئی اصطلاحات کا استعمال ہمارے معاشرے کے حوالے سے ہو رہا ہے وہ اس بات کی علامت ہیں کہ عوامی ذرائع ترسیل کی رسائی فرد سے لے کر پورے معاشرے تک کس قدر ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ نئی اصطلاحات ماس میڈیا کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ، عوامی ذرائع ترسیل کی بالکل نئی شکل ہے جس کو نئی میڈیا (New Media) کا نام دیا گیا ہے۔ انٹرنیٹ انفارمیشن ٹکنالوجی کی نایاب دین ہے جس نے روایتی میڈیا کے لیے کئی چیلنج بھی پیدا کیے ہیں۔ آج انٹرنیٹ پر دنیا کے تقریباً تمام اخبارات پڑھنے کو دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ تمام ٹی.وی. چینل اور ریڈیو نشریات کو انٹرنیٹ پر سن سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں۔ اردو سافٹ ویئر کی ایجاد کے بعد اردو کے اکثر و بیشتر روز ناموں نے اپنا انٹرنیٹ ایڈیشن شروع کر دیا ہے جس میں ہندوستان سے شائع ہونے والے انقلاب، منصف، سیاست وغیرہ اور پاکستان سے شائع ہونے والے اخبارات جنگ، نوائے وقت وغیرہ شامل ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں ہم تمام ادبیات عالم کا مطالعہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے اردو ادب بھی مستثنیٰ نہیں۔ اردو کی تمام اہم کتابیں انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ یہ کتابیں اگر اردو میں دستیاب نہیں ہیں تو ان کے تراجم موجود ہیں جن سے قارئین کم از کم بلاواسطہ تو اردو ادب سے متعارف ہو رہے ہیں۔ گویا انٹرنیٹ نے اردو زبان و ادب کے دائرۂ اثر کو آفاقیت کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔

219, Jhelam Hostel
JNU, New Delhi-110067

□□□

انصار احمد معروفی

قدیم مخطوطات و مطبوعات کا تحفظ

جب تک کاغذ وجود میں نہیں آیا تھا لوگ اپنی بات، یادداشت، علوم و فنون اور دستاویزات کو جانوروں کی جھلیوں، درختوں کی چھالوں اور پتوں، اس کی تختیوں اور پتھروں پر نقش کر کے محفوظ کرتے تھے، اس کام کے لیے جانوروں کی بڑی ہڈیوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چین میں سب سے پہلے 105ء میں کاغذ تیار ہوا اور اس پر چینی لوگ اپنی باتوں کو لکھنے لگے، لیکن اس نئی ایجاد کو انھوں نے تمام دنیا والوں سے مخفی رکھا اور کسی کو اس کی خبر نہیں لگنے دی۔ اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں جب مذہب اسلام کا سورج طلوع ہو کر دیار عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں پر بھی اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا چند چینی قیدی روس کے علاقوں سے جنگ کے دوران مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ مسلمانوں میں علوم و فنون کی اہمیت کے پیش نظر ان قیدیوں سے ان علوم و فنون کا سکھلانا ہی ان قیدیوں کا ''زرِ فدیہ'' قرار پایا، اور اس طرح کاغذ بنانے کا یہ فن چینی قیدیوں کے ذریعے عربوں اور مسلمانوں میں آیا اور اس طرح آیات و احادیث و دیگر علوم ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر منتقل ہو گئے۔ ہندوستان میں یہ فن اس وقت آیا جب اس پر چھ صدی اور گزر گئی تھی۔ ابتدا میں یہ کاغذ ہاتھ سے بنتے اور ریشے دار ہونے کی وجہ سے بہت مضبوط اور تیزابیت سے پاک ہوتے تھے۔ بعد میں سائنس کی ترقی ہوئی اور مشین سے کاغذ بننے لگے مگر ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ کے مقابلے میں یہ کم زور اور مختلف کیمیکل کی آمیزش کی وجہ سے تیزابیت زدہ اور بہت چھوٹے ریشے والے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت جلد پھٹ جاتے ہیں۔ اب جتنے کاغذ بازار میں دستیاب ہیں وہ مشینی ہوتے ہیں۔ پرانے مخطوطات جن پر کئی صدیاں بیت چکی ہیں، ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ کے ہونے کی وجہ سے اب بھی محفوظ اور مضبوط ہیں۔

کتابوں کو ضائع ہونے سے بچانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کو ہر ایرے غیرے کے ہاتھ نہ دے دیا جائے، کیوں کہ وہ اس کی حقیقت اور اہمیت نہ سمجھ کر اس کو ادھر ادھر ڈال دے گا اور اسے غیر مصرف بھی کرے گا، اسی طرح بہت باذوق حضرات کو بھی بہ طور مستعار مطالعہ کے لیے نہ دی جائے کہ وہ اس کو واپس کرنے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے اکثر حضرات اس کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ میرے پاس فلاں کتاب تھی جسے میں نے فلاں جگہ سے اتنے میں خریدی تھی وہ اب نظر نہیں آ رہی ہے، اور یاد بھی نہیں آتا کہ کون اسے لے گیا ہے؟ اس طرح کتنی ہی کتابیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ کتابوں کی چوری کو لوگ 'چوری' بھی نہیں سمجھتے۔

کتابوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جلد سازی کرا دی جائے تاکہ خارجی حملہ آوروں سے اس کی حفاظت ہو سکے۔ اگر مخطوطہ یا مطبوعہ کے اوراق، کونے، پشتے اور سرے پھٹے ہوئے ہوں تو اس کو سب سے پہلے درست کرنا ہوگا، اس کے حاشیوں کو صحیح اور برابر کرنا ہوگا۔ کتابوں کی بائنڈنگ کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اس طرح سلائی ہو کہ اگر اس کے اجزا اور صفحات کی فوٹو کاپی کرانی ہو تو پوری طرح کھل سکے، نیز اس طرح بائنڈنگ کی جائے کہ اگر اس کی دفتی کا کونا یا سلائی کا دھاگا ٹوٹ جائے یا جلد خراب ہو جائے تو پھر نئے سرے سے آسانی کے ساتھ اس کی دوبارہ جلد سازی ہو سکے، اس کے دھاگے کے اجزا کچھ ڈھیلے اور کچھ بہت ٹائٹ نہ ہوں، اس میں جو کپڑے اور کاغذ استعمال ہوں وہ پرانے اور کم زور نہ ہوں، نیز نئے کپڑوں کی مانڈ دھل کر نکال لی جائے ورنہ کتابوں کو کھا جانے والے کیڑے اس مانڈ کی وجہ سے پیدا ہو جائیں گے۔ سلائی کے بعد کتابوں کو عارضی طور پر جوڑنے کے لیے جو لوہے کی کلیف لگائی جاتی ہے اس کو باہر کر دیا جائے ورنہ وہ برسات کی رطوبت اور نمی سے متاثر ہو کر زنگ آلود ہو کر اوراق کو خستہ کر دیتے ہیں اور اوراق پھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹی اور بڑی کتاب کے اعتبار سے دفتی، کپڑا یا چمڑے کا انتخاب کیا جائے۔ جو لیپی اور مانڈ استعمال کی جائے اس میں توتیا اور پھٹکری کی آمیزش نہ ہو، کیوں کہ اس کے ذریعے سے کاغذ میں تیزابیت لیپی کے ذریعہ منتقل ہو جاتی ہے۔ عام طور سے جو چمڑے کی جلد ہوتی ہے اس کا پشتہ جہاں سے کتاب کی دفتی مڑتی ہے وہ چمڑا ٹوٹ جاتا ہے اور چند ہی دن میں وہ پشتہ ٹوٹ کر دفتی الگ اور کتاب پھر غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے مارکیٹ میں ''سوڈیم بینزاناٹا سلوشن'' آتا ہے، جسے "L.P. Mictur" کہتے ہیں۔ اس کا استعمال صرف چمڑے کی بائنڈنگ کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ سلوشن کتابوں کی جلد کے پیچھے جو چمڑا ہوتا ہے پہلے اس کو

گرد وغبار سے صاف کر کے اس پر روئی کے ذریعے لگایا جاتا ہے۔ ایسا کئی بار وقفے وقفے سے کیا جائے تو وہ مزید مضبوط اور دیرپا ہو جائے گا اور ٹوٹنے سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔

کتابوں کو رکھنے کے لیے اکثر الماریوں کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ الماریاں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک الماری تو وہ ہے جو گھر بناتے وقت دیواروں میں ہوتی ہیں۔ مالیات کی کمی کی وجہ سے اکثر حضرات اپنی کتابیں انھی دیواروں کی الماریوں میں رکھتے ہیں جو مضر ہوتی ہیں، کیوں کہ کتابوں کے لیے بارش کی رطوبت اور ''لو'' کی تپش نقصان دہ ہوتی ہے۔ دیواروں میں جو الماری ہوتی ہے وہ موسم کے اعتبار سے نمی اور تپش سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ دوسری وہ الماری ہوتی ہے جو لکڑی سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ الماری اچھی ہے بشرطیکہ اس میں دیمک نہ ہوں، جو لکڑیوں کو ڈھیر ڈھیر سے سفوف میں تبدیل کر کے کھوکھلی بنا دیتی ہیں اور پھر وہ کیڑے کتابوں میں بھی متعدی ہو کر پھیل جاتے ہیں اور کتاب کو اپنی خوراک بنا لیتے ہیں، اس لیے لکڑی کی الماری بنوانے سے پہلے اس کی لکڑی کو کم از کم دو ہفتے خشک کر لیا جائے۔ تیسری الماری آجکل لوہے کی آتی ہے لیکن اس میں پینٹنگ ضرور ہونی چاہیے ورنہ وہ الماری زنگ آلود ہو کر کتابوں کو شکستہ بنا دے گی۔ بہر حال الماری جیسی بھی ہو، کتابوں کو رکھنے کے لیے اس کے نیچے کاغذ یا کپڑے بچھانے ضروری ہیں۔ اگر کپڑے بچھانے ہوں تو اس کا رنگ لال ہونا چاہیے اور اس کی مانڈ نکال لینی چاہیے۔ لال رنگ کیڑوں سے حفاظت کرتے ہیں، اسی لیے بہی کھاتے کی جلد کو لال کپڑے سے مجلد کیا جاتا ہے۔ اگر کاغذ بچھا کر کتاب رکھنا ہو تو ہینڈ میڈ پیپر کو پیرا ڈائی کلورو بین جین میں بھگو لیں پھر سایہ میں خشک کر کے اس پر کتاب رکھیں، یا عام کاغذ کو چونے کے پانی میں بھگو کر پھر خشک کر کے اس کے نیچے کتاب رکھیں۔ الماری کو دیواروں سے دور اور زمین سے اوپر رکھیں۔ اگر ممکن ہو تو کتاب کو بالکل زمین سے لگے ہوئے الماری کے نچلے خانے میں نہ رکھیں، نیز یہ الماریاں اگر شیشہ یا لکڑی سے بند ہو سکے تو بہت بہتر ہے ورنہ کپڑے کا پردہ بھی غنیمت ہے تاکہ گرد وغبار سے اسے بچایا جا سکے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری لائبریری کن کن چیزوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً مخطوطہ، مطبوعہ، دستاویز، فرامین، نقشے، پینٹنگ، برتن، سکے، فوٹو گرافی، مائکرو فلم، تاڑ پتر، بھوج پتر وغیرہ۔ اس کے بعد یہ جاننا ہوگا کہ ان کو خراب کرنے والی کیا کیا چیزیں ہیں جیسے کیڑے جو مختلف رنگ ونسل اور سائز کے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں کاغذ کو چاٹ ڈالتے ہیں اور عمودی وافقی شکل میں چاٹ چاٹ کر ڈاکومنٹ کو ہضم کرتے رہتے ہیں۔ بعض کاغذ وغیرہ میں گولائی کی شکل میں بل کر دیتے ہیں۔ تیز مضر چیزوں میں وہ رطوبت ہے جو ساٹھ فیصد سے زائد نہ ہو، اسی طرح درجۂ حرارت 25 سے زائد مضر ہوتا ہے۔ نیز دھول مٹی، پھپھوندی، بہت تیز روشنی، بے توجہی، فضائی آلودگی، تیزابیت، چوہے، کبوتر، طوفان، زلزلے، آتش زنی، اور پانی وغیرہ لائبریری کو خراب کر دیتے ہیں۔ ان میں گرد وغبار بہت زیادہ مضر ہے۔ اس سے ڈھیر ڈھیر کیڑے مکوڑے وہاں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تساہلی اور گندگی کی وجہ سے کاکروچ اور چوہے وغیرہ وہاں بسیرا کر لیتے ہیں جو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ فضائی آلودگی جیسے وہاں مشین اور کارخانے ہیں ان کے دھوئیں اور آلودگی بھی کتابوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ پانی کی وجہ سے نمی زیادہ ہو کر کاغذ کو بلکہ پوری کتاب کو مع جلد ٹیڑھی اور پیلی و داغدار بنا دیتی ہے اور جلدوں کو توڑ دیتی ہے۔ پانی لگنے کی وجہ سے کتاب پر پھپھوندی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے کاغذ کالا ہو جاتا ہے، یا دھبہ لگ جاتا ہے پھر وہ کمزور ہو کر ٹوٹنے لگتا ہے۔ مکڑی وغیرہ بھی ضرر رساں ہے۔ بہت زیادہ رطوبت اور نمی کی وجہ سے بھی کتاب میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جو دستاویز کو کھا جاتے ہیں۔ رطوبت اور تپش اخباروں میں ناپ کر لکھی جاتی ہے نیز مشین کے ذریعے بھی لائبریریوں وغیرہ میں اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت زیادہ روشنی بھی نقصان دہ ہے بالخصوص سورج کی روشنی سے کتاب کو بہت بچانا چاہیے، کیوں کہ اس میں ایک روشنی ''الٹراوائلٹ'' ہوتی ہے۔ یہ روشنی شیشے کو بھی پار کر کے کاغذ کو آہستہ آہستہ کمزور کر دیتی ہے اور پھر کاغذ ٹوٹنے لگتا ہے۔ ٹیوب لائٹ میں بھی ''الٹراوائلٹ'' طاقت ہوتی ہے جس کو پیدا کرنے کے لیے ''اسٹارٹر'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر اس کے ساتھ بلب کی روشنی ہو تو یہ مخلوط روشنی غیر مضر ہو سکتی ہے۔ آگ سے لائبریری کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے آگ بجھانے کے لیے ہیلین گیس، یا کاربن ڈائی آکسائڈ گیس دارالمطالعہ کے لیے رکھنا بہت ضروری ہے۔ بجلی کے تار بھی اس میں کھلے نہ رکھنے چاہئیں کہ اس سے بھی آتش زنی کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسے ہی بجلی بورڈ پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالنا چاہیے۔

الماری میں ایک سائز کی کتاب ایک خانے میں رکھیں۔ کتاب کو ایک ساتھ ایک خانے میں چھوٹی بڑی ہونے کی صورت میں کتابوں کے مڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے اور جلدیں ٹوٹ سکتی ہیں، اس طرح کتابیں سیدھی رکھی جائیں تاکہ دوسری کتابوں پر بوجھ نہ پڑے۔ بیچ یا کنارے سے کتاب نکالنے کی صورت میں بہت احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ کتابوں کی روزانہ صفائی کی

جائے اور باہر لے جاکر اس کو صاف کریں، ورنہ وہ گرد وغبار پھر دوسری کتابوں میں منتقل ہو جائے گا۔ کتاب کو احتیاط سے پکڑیں، کونا نہ پکڑیں۔ کتاب کی ایک طرف کی دفتی پکڑنے اور بے احتیاطی سے کتابیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کتابوں میں اگر پھپھوندی لگ گئی ہو تو اس میں فنس پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اس میں پودے کی طرح اگ جاتا ہے۔ یہ تھائی مول کی دھونی سے ختم ہوسکتا ہے۔ اس تھائی مول کو ایک پلیٹ میں رکھ کر اس کے نیچے 40 واٹ کا بلب لگا کر ایک ہفتہ رکھنا ہوگا۔ ایک الماری کے لیے 300 گرام کافی ہے۔ اس کو الماری کے سب سے نیچے خانے میں رکھنا ہوگا، نیز الماری بالکل بند ہونی چاہیے۔ ذرا بھی سوراخ کہیں ہو تو اس کو ٹیپ سے بند کر دیں۔ الماریوں کے خانے جالی دار ہوں تاکہ اس کا دھواں نیچے سے اوپر تک جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ کتابیں الٹ کر رکھی جائیں۔ یہ عمل پھپھوندی لگنے کی شکل میں کریں گے۔

اگر کتابوں میں کیڑے لگ گئے ہوں تو مذکورہ بند الماری میں ایک ہفتہ کے لیے ''امونیا'' یا پیراڈائی کلورو بین جین'' کی دھونی دیں۔ یاد رکھیے اس کو الماری کے سب سے اوپر خانے میں رکھنا ہوگا۔ نیز پورے کمرے کو جراثیم اور کیڑے مکوڑوں سے حفاظت کے لیے 50 گرام تھائی مول اسپرٹ یا پانی میں گھول کر اسپرے پمپ کے ذریعے کمرے کے چاروں طرف چھڑک دیں۔ یہ ایک زہر ہے اس لیے بچوں اور کھانے پینے کی اشیا سے اسے دور رکھنا ہوگا، نیز اس عمل کے بعد ڈیٹول وغیرہ سے ہاتھ صاف کرنا بھی ضروری ہوگا۔ کتابوں کی حفاظت کے قدرتی ذرائع بھی اللہ تعالی نے بنائے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے بارے میں ہمیں اپنے بڑوں سے معلومات حاصل ہیں۔ جیسے نیم کے پتے، مور کے پنکھ، سانپ کی کینچلی وغیرہ۔ نیز کپور اور ہلدی کو پیس کر ایک پوٹلی میں رکھ کر الماری میں رکھ دینے سے کیڑوں سے حفاظت ہوتی ہے۔ نیم کے پتوں کو سائے میں خشک کر کے یا اس کا سفوف بنا کر کتابوں میں رکھنے کے بجائے کتاب کے قریب الماری میں رکھ کر حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دس دس گرام زیرہ، دال چینی، کالی مرچ اور لونگ آپس میں پیس کر ایک سفید کپڑے کی پوٹلی میں رکھ کر الماری میں رکھنے سے بھی تحفظ ممکن ہے۔

کتاب کو تیزابیت سے بھی محفوظ رکھنا ہوگا۔ یہ تیزابیت کبھی تو کاغذ کی ساخت سے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں ایسے مادے ہوتے ہیں جو تیزابیت کو جنم دیتے ہیں۔ فضائی آلودگی، دھول مٹی، خراب سیاہی، نیز تیزابیت والی کتاب کے ساتھ اچھی کتاب کو رکھ دینے کی وجہ سے وہ تیزابیت نئی کتاب میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خود انسان اس تیزابیت کے وجود کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ وہ بے توجہی اور غفلت برتتا ہے۔ یہ تیزابیت امونیہ کے ذریعے بند الماری میں دھونی سے 48 گھنٹے میں دور کی جا سکتی ہے۔

کتابوں کے خراب ہونے میں بے توجہی اور قاری کی عدم دلچسپی بھی خاص وجہ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے حضرات ''مانگے کی کتاب'' کے ساتھ سوتیلا سلوک برتتے ہیں۔ اپنی خریدی ہوئی کتاب کی حفاظت کے سلسلے میں وہ کچھ احتیاط بھی کرتے ہیں، لیکن لائبریری، مدرسہ اور کالج کے کتب خانے یا کسی دوست سے مانگ کر پڑھی جانے والی کتاب کے ساتھ بڑی بے احتیاطی وتساہلی برتتے ہیں، جب کہ بعض حضرات کتابوں کے مضامین اور اس کے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے بھی اپنے حفاظتی عمل کو بروئے کار لاتے ہیں۔ مثلاً درسی، مذہبی، اخلاقی اور ادبی کتابوں کی خصوصی حفاظت کے بجائے مخرب اخلاق اور فحش کتابوں کے پڑھنے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کی کافی جدوجہد کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس پر کوئی داغ دھبہ نہ آئے اور وہ علی حالہ صحیح سالم رہے۔

Chashma-e-Faiz
Adri, Mau (U.P.)
Pin-275102.

□□□

اگلے شمارے سے ہم ''اردو روزمرہ'' کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کر رہے ہیں جس میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کا جواب دیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کا صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔

(ادارہ)

اقبال محی الدین

ہندوستان میں ریموٹ سنسنگ

آج کے سائنسی ترقیاتی دور میں ہندوستان نے خلائی سائنس کے میدان میں بھی بہت ترقی کرلی ہے۔ پہلے کسی جگہ کی تفصیلی معلومات کے لیے زمینی سروے کیا جاتا تھا جس میں بہت دقت ہوتی تھی اور وقت بھی بہت صرف ہوتا تھا۔ اب ریموٹ سنسنگ (Remote Sensing) کی تکنیکی مدد سے خلا سے سٹلائٹ کے ذریعے مخصوص کیمروں یعنی Sensors سے زمینی تصاویر کو تکنیکی جس کے ذریعے لیا جاتا ہے۔ اس عکس کو Imagery کہتے ہیں۔ بعد میں انھی Imageries کی مدد سے مطلوبہ مقامات کے نقشے بنائے جاتے ہیں جو بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ اس تکنیکی جس سے زمین کی فضا، زمین کے اوپر، سمندروں کی سطح اور گلیشیروں کی تصاویر لی جاتی ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں کہاں پانی کے ذخائر ہیں اور کہا کہاں قدرتی وسائل ہیں؟ کس جگہ زمین کا کیا استعمال ہو رہا ہے؟ یا کس استعمال کے لیے کون کون سی جگہیں مناسب ہوں گی۔ اس تکنیک سے خصوصاً زراعت کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔

ہندوستان کا اپنا ریموٹ سنسنگ سٹلائٹ 1986 کے آخر میں خلا میں چھوڑا گیا تھا جو وہاں سے سطح ارض کی تصاویر بھیجتا رہا جس سے یہ معلوم ہوتا رہا کہ زراعت کے استعمال کے لیے کتنی مزید زمین اور کام میں لائی جاسکتی ہے۔ زمین کا بہترین استعمال کس طرح ہو یہ اس سٹلائٹ کے بھیجے ہوئے Digital Data اور Imageries سے معلوم ہوتا رہا۔

سطح زمین کے مختلف حصوں کے نقشے پہلے بھی ہوائی جہاز کے ذریعے اوپر جاکر تصویریں لے کر بنائے جاتے تھے مگر اب ریموٹ سنسنگ کی تکنیک بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ خلا سے یہ سٹلائٹ اپنے Scanners کے ذریعے ان جگہوں کی تصاویر کی تفصیلات اپنے اندر Digital نمبروں میں لیے گئے زمین کے اعداد وشمار کو سائنس داں Imageries میں تبدیل کر دیتے ہیں جو ریسرچ کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات کو یہ مخصوص کیمرے Imageries میں دکھا دیتے ہیں۔ بہت کم وقت میں، بڑے سے بڑے علاقوں کی باریک سے باریک تفصیلات کو وہ اپنے اندر مقید کر لیتے ہیں۔ بعد میں انھی Imageries کی مدد سے ان جگہوں کے بہت تفصیلی نقشے تیار کر لیتے ہیں۔ اسی لیے ریموٹ سنسنگ آج کے موجودہ سائنسی دور کا بہترین کرشمہ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ریموٹ سنسنگ کے تکنیکی پہلو پر گفتگو کریں یہ مناسب ہوگا کہ ہندوستانی سٹلائٹس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کریں جو ریموٹ سنسنگ کے Sensors کو لے کر خلائے بسیط میں جاتے ہیں اور وہاں سے مطلوبہ علاقوں کے Digital اعداد وشمار بھیجتے ہیں۔

ہندوستانی سٹلائٹس:

ہندوستان نے اپنا پہلا سٹلائٹ ''آریہ بھٹ'' روسی راکٹ کے ذریعے 19 اپریل 1975 کو چھوڑا تھا۔ اس طرح ہندوستان بین الاقوامی خلائی کلب کا گیارہواں ممبر ملک بن گیا تھا۔ دوسرا سٹلائٹ بھاسکر۔ I اور بھاسکر۔ II 7 جون 1979 کو داغا گیا تھا۔ ان سٹلائٹس کے نام ایک علم نجوم کے ماہر اور علم ریاضی کے ماہر کے ناموں پر رکھا گیا تھا۔

تیسرے ہندوستانی سٹلائٹ ''روہنی'' کو مدار ارض پر 18 جولائی 1980 کو رکھا گیا۔ 31 مئی 1981 کو ہندوستان کا چوتھا سٹلائٹ ''روہنی۔ II جو RS-D1 کہلاتا ہے، سری ہری کوٹا سے خلائے بسیط میں چھوڑا گیا۔ یہ ہندوستان کی پہلی ترقی یافتہ راکٹ فلائٹ تھی۔

17 اپریل 1983 کو ہندوستان نے ''روہنی'' سٹلائٹ جو RS-DII کہلاتا ہے، اس کو کامیابی سے خلائے بسیط میں داغا۔ اس کامیابی سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی بہت سی راہیں کھل گئیں۔

زمین کے مشاہدہ کا سٹلائٹ بھاسکر۔ III ہندوستان کا پانچواں سٹلائٹ تھا۔ اس کے علاوہ Apple یعنی Ariane Passenger Payload Launch Experiment کورو سے چھوڑا گیا۔ کورو فرنچ گیانا میں وہ مقام ہے جو بحر اٹلانٹک کے ساحل پر واقع ہے۔ 19 جون 1981 کو یہ سٹلائٹ راکٹ Ariane کے ذریعے خلائے بسیط میں بھیجا گیا۔

10 اپریل 1982 کو Insat-IA یعنی انڈین نیشنل سٹلائٹ، کینیڈی اسپیس سینٹر، کیپ کناریل، فلوریڈا، سے داغا گیا۔ اس سٹلائٹ کی کامیابی کے بعد ہندوستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ ممالک کی صف اوّل میں آگیا۔ لیکن یہ مشہور و معروف سٹلائٹ جس کو کثیر المقاصد سٹلائٹ کے

نام سے جانا جاتا ہے اس نے 6 ستمبر 1982 کو کام کرنا بند کر دیا۔

INSAT-IB 31 اگست 1983 کو U.S. Space Shuttle Challenger کے ذریعے خلا میں چھوڑا گیا جو 15 اکتوبر 1983 سے پوری طرح کام کرنے لگا۔ یہ ہندوستان کا نواں سٹیلائٹ تھا۔ وہ زمین کی گردش کے ساتھ اسی رفتار سے گھوم رہا تھا جس رفتار سے زمین گھوم رہی تھی۔ ایسی صورت کو Geo-Stationary Position کہتے ہیں۔ یہ سٹیلائٹ تین طرح کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ یعنی — مواصلاتی، نشریاتی اور موسمیاتی۔

INSAT-IC 22 جولائی 1988 کو مدار ارضی میں کورو کے مقام سے چھوڑا گیا۔ اس کا ایک اینٹینا خراب ہو جانے سے اس میں کئی تکنیکی خرابیاں پیدا ہو گئیں جس کی وجہ سے یہ سٹیلائٹ بیکار ہو گیا۔

انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) نے بالآخر INSAT-ID کو خلا میں کامیابی سے چھوڑا۔ اسی طرح ہندوستان دوسرے سٹیلائٹ خلائے بسیط میں چھوڑتا رہا تاکہ سائنسی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ سائنسی ترقی پر امن مقاصد کے لیے ہوئی جس سے ہندوستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ شانہ بہ شانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹس:

IRS-IA سٹیلائٹ ریموٹ سنسنگ کے اعلیٰ مقصد کو لے کر بیکانور نامی مقام سے روس سے 1988 میں چھوڑا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان دنیا کا پانچواں ملک ہو گیا جو ریموٹ سنسنگ کی تکنیک کو خلائے بسیط سے کنٹرول کرتے ہیں۔

IRS-IB سٹیلائٹ ریموٹ سنسنگ کی ریسرچ کے مقصد کو لے کر 29 اگست 1999 کو خلا میں چھوڑا گیا۔

IRS-IA/IB اپنے ساتھ Linear Self Scanning Sensor - LISS - I and LISS-II کو اپنے ساتھ خلا میں لے گئے تھے جن کی وجہ سے سطح ارض کی بہترین اور بہت تفصیلی Imageries تیار ہوئی تھیں۔

IRS-IB کے بعد IRS-IC کو خلا میں داغا گیا تھا جو اپنے ساتھ بہترین Sensors جیسے LISS-II Pan Cameras اور WIFS کو لے کر گیا تھا۔

IRS-ID کو PSLV لانچ وہیکل کے ذریعے سری ہری کوٹا سے چھوڑا گیا تھا۔

IRS-P3 کو سن سنکرونس آربٹ (Sun Synchronous Orbit) میں PSLV-D3 لانچ وہیکل کے ذریعے سری ہری کوٹا سے 21 مارچ 1999 کو چھوڑا گیا تھا۔

IRS-P4 اپنے ساتھ Multi-Frequency Scanning Microwave Radiometer (MSMR) اور Ocean Colour Monitor (OCM) لے کر خلائے بسیط میں گیا تھا۔ اس طرح IRS-P4 سب سے بہترین Spatial Resolution یعنی سب سے زیادہ تفصیلی معلومات مہیا کرنے والا سٹیلائٹ بن گیا جس کا دوسرے سٹیلائٹ بین الاقوامی سطح پر بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ MSMR موسمیات کی پیشین گوئی کرنے میں موجودہ سائنسی دور میں اعلیٰ ترین ثابت ہوا۔

IRS-P6 ہندوستان کا بہت عمدہ موجودہ دور کا ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹ ہے جس میں LISS-IV Sensor لگا ہے جس کو خلا میں PSLV کے ذریعے چھوڑا گیا تھا۔ اس سے حاصل شدہ اعداد و شمار زیادہ تر زراعتی ترقیات PSLV میں استعمال ہوتے ہیں۔

Cartosat-I ہندوستان کا موجودہ ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹ ہے جو 5 مئی 2005 کو PSLV-VI کے ذریعے خلائے بسیط میں چھوڑا گیا تھا۔ اس سٹیلائٹ کو 618 کلومیٹر کی اونچائی Polar Sun Synchronous Orbit پر نصب کیا گیا۔ اس کو ہندوستان کے بالکل نئے لانچنگ پیڈ ستیش دھون اسپیس سنٹر سے خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ کارٹوسیٹ-I اپنے ساتھ دو بہت عمدہ پین کرومیٹک (Panchromatic) کیمرے لے گیا جو کالی، سفید تصاویر کو اپنے اندر سمونے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ کارٹوسیٹ-I سے حاصل شدہ اعداد و شمار بڑے پیمانوں کے نقشوں کے بنانے میں، طوفان سے تباہ شدہ علاقوں کا تخمینہ لگانے میں، دیگر نقشہ نویسی میں اور مختلف طرح کی Geo-Spatial Mapping میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے حاصل شدہ DATA طبعی ارضیات کے نقشوں کو نئے سرے سے بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی INSAT Series کے سٹیلائٹ Geo-Stationary Orbit پر نصب کیے گئے ہیں جو خط استوا (Equator) سے 36,000 کلومیٹر کی اونچائی پر ہیں اور زمین کے برابر کی رفتار سے اس کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ وہ موسمیات، نشریات اور مواصلات کی اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے ہیں جب کہ IRS Series کے سٹیلائٹ Polar Synchronous سٹیلائٹ ہیں جو قطبین (Poles) پر 600-900 کلومیٹر کی اونچائی پر نصب کئے گئے ہیں اور قدرتی وسائل کے متعلق اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

مستقبل کے انڈین ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹ مشن کے لیے اعلیٰ ٹیکنالوجی سے لیس Sensors کا استعمال ہوگا تا کہ نقشہ نویسی، علم زراعت، علم نباتات، علم بحریات اور علم ماحولیات کا مطالعہ بخوبی کیا جا سکے۔

ہندوستان کے خلائی پروگرام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اسپیس ٹیکنالوجی کا استعمال مواصلات، نشریات، موسمیات اور ریموٹ سنسنگ میں کرے۔ اس سلسلے میں اس پروگرام نے میل کے پتھر کو کامیابی کے ساتھ طے کر لیا ہے کیونکہ بھاسکر۔I اور II اس سلسلہ کی مضبوط کڑی ہیں جو اپنے ساتھ ٹی وی کیمرے اور مائیکرو ویو ریڈیو میٹرس (Microwave Radiometers) لے کر خلائے بسیط میں گئے تھے۔ انڈین ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹ جن اہم سائنسی میدانوں میں براہ راست معلومات بہم پہنچاتا ہے وہ ہیں جنگلات، جیولوجی، زراعت اور پانی کے ذخائر۔

ریموٹ سنسنگ کا استعمال:

ریموٹ سنسنگ کا استعمال جن جگہوں پر ہوتا ہے وہ ہیں:

1. جیولوجی کے میدان میں جہاں ریموٹ سنسنگ کا استعمال علاقائی جیولوجی اور Lineament Studies میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ Alteration Mapping، Lithological Mapping معدنیات کی نشاندہی، تیل کی تلاش، یورینیم کی تلاش اور زمین کے طبعی خدوخال کے مطالعے میں ریموٹ سنسنگ کا استعمال ہوتا ہے۔
2. قدرتی نباتات اور زراعت کے میدان میں ریموٹ سنسنگ کی مدد سے جنگلات کے نقشے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فصلوں کی پیداوار کا تخمینہ لگانے میں اور قدرتی نباتات کی تباہ کاری کا تخمینہ لگانے میں ریموٹ سنسنگ بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔
3. مٹی اور پانی کے وسائل کی معلومات میں بھی ریموٹ سنسنگ بہت مفید ہے۔ اس سے مٹی کے نقشے، مٹی اور قدرتی نباتات کا تال میل، سطح ارض کا اور زمین میں پانی کا مطالعہ، برف باری اور گلیشیر کے نقشے، برف کے پگھلنے کا تخمینہ، پانی کے ذخائر کا مطالعہ، سیلاب کے نقشے اور Catchment اور Command Area Survey میں ریموٹ سنسنگ بہت کارآمد ہے۔
4. ماحولیات اور قدرتی تباہ کاری کے مطالعے میں بھی ریموٹ سنسنگ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سمندری سطح کا مطالعہ، مٹی کی پرتیں، پہاڑوں سے مٹی اور پتھروں کا گرنا، بارش یا سیلاب سے مٹی کا کٹاؤ، جنگلات کی کٹائی، سیلاب اور زلزلے سے تباہی، آتش فشاں کی Monitoring اور جنگلات و کوئلہ کی کان میں آگ لگنے کا مطالعہ بھی ریموٹ سنسنگ کی وجہ سے بہت آسان ہو گیا ہے۔
5. زمین کے استعمال اور زمین پر جنگلات کے اعداد و شمار کا مطالعہ بھی ریموٹ سنسنگ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ زمین کے استعمال کا نقشہ، آبادی، شہری ترقیات اور پلاننگ اور زمینی وسائل کا سروے ریموٹ سنسنگ کی وجہ سے بہت آسان ہو گیا ہے۔
6. سمندری سطح پر Oil-Slick کا مطالعہ، سمندری Plankton اور مچھلیوں کے ذخائر کی معلومات ریموٹ سنسنگ کی وجہ سے بہت آسانی سے ہو جاتی ہے۔

اس طرح ریموٹ سنسنگ ہماری زندگی کو خوشحال بنانے میں اور سائنسی ترقیات میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ریموٹ سنسنگ کے تکنیکی پہلو:

ہندوستانی سٹیلائٹ اور خاص طور سے ہندوستانی ریموٹ سنسنگ سٹیلائٹ کی تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد اب ہم ریموٹ سنسنگ کے تکنیکی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ریموٹ سنسنگ کیا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں اور اس کا ہندوستانی سائنسی ترقیات میں کیا کردار رہا ہے؟

ریموٹ سنسنگ (Remote Sensing) کے معنی ہیں کسی شے یا سطح ارض سے متعلق تفصیلی معلومات خلائے بسیط سے سٹیلائٹ میں لگے مخصوص کیمروں یعنی Sensors کے ذریعے حاصل کرنا۔ ریموٹ سنسنگ نئی ٹیکنالوجی سے جڑا ہوا ہے جس میں سٹیلائٹ یا خلائی جہاز سطح ارض کی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کی ترقیات 1960 کی دہائی سے شروع ہوئی۔ ریموٹ سنسنگ یا تو Passive ہوتی ہے یا Active System-Active کی اپنی توانائی ہوتی ہے، جیسے Radar جب کہ Passive System باہری ذرائع توانائی پر منحصر ہوتی ہے جیسے سورج یا ریموٹ سنسنگ کے لیے اشیا کی منعکس توانائی۔

ریموٹ سنسنگ کے اصول یہ ہیں کہ کسی شے یا سطح زمین پر جب سورج کی کل شعاعیں Electro-Magnetic Radiation (EMR) پڑتی ہیں تو وہاں کی اشیا بھی ان EMRS کو کچھ اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں اور بقیہ کو منعکس کر دیتی ہیں۔ الگ الگ طرح کی اشیا مختلف مقدار کی توانائی Electromagnetic Spectrum کے الگ الگ Bands پر منعکس کرتی رہتی ہیں۔ یہ نقطۂ انعکاس زمین کی بناوٹ، کیمیائی حالت اور طبعی کیفیت پر منحصر

ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ سطح ارض کا کھردراپن، سورج کی کرنوں کا زمین پر بنتا زاویہ، رفتار انعکاس اور نکلی ہوئی توانائی کی رفتار پر بھی منحصر ہوتی ہیں۔

Electromagnetic Spectrum میں گاما ریز، ایکس ریز، الٹراوائیلٹ لائٹ، قابل بصیرت (Visible) لائٹ، انفرا ریڈ لائٹ، مائیکرو ویوز اور ریڈیو ویوز شامل ہیں۔ انسانی آنکھ صرف وزی بل لائٹ کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ بقیہ کو ریموٹ سنسنگ (Remote Sensing) کے مخصوص کیمرے یا Sensors ہی دیکھ سکتے ہیں اور اپنے اندر ان کی تصاویر کو سمو سکتے ہیں۔ اسی لیے خلائے بسیط یہ Sensors اپنی تکنیکی جس کے ذریعے سطح زمین کی باریک سے باریک تفصیلات ہم تک Digital Data کی شکل میں پہنچا دیتے ہیں، جن کو بعد میں سائنس داں Imageries میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

ریموٹ سنسنگ دراصل بنیادی طور پر کثیر المقاصد سائنسی علوم پر منحصر ہے جو مختلف علمی میدانوں کا احاطہ کرتی ہے جس میں Optics، Spectroscopy، فوٹوگرافی، کمپیوٹر، Electronics، مواصلات اور سٹیلائٹ کی اڑان جیسے سائنسی مضامین شامل ہیں۔ یہ سارے سائنسی مضامین کی ٹیکنالوجی پورے ایک نظام میں گندھی ہوئی ہیں جس کو ریموٹ سنسنگ سسٹم کہتے ہیں۔ ریموٹ سنسنگ میں کئی مراحل شامل ہیں جن کے آپسی تال میل کے بغیر کامیاب نتائج نہیں نکل سکتے۔ یہ مراحل ہیں— (1) EMR کا نکلنا (سورج سے یا خود سے)، (2) توانائی کا خروج سے نکل کر سطح زمین پر پہنچنا، (3) EMR کا سطح زمین سے تعلق قائم کرنا اور منعکس ہونا، (4) توانائی کا اخراج اور ریموٹ Sensor تک پہنچنا، (5) Sensor Data حاصل کرنا، (6) Data کو ریموٹ Sensor سے زمین پر بھیجنا اور اس کی Processing اور Analysis کرنا۔ یہ سارے مراحل طے کرنے کے بعد ہی ریموٹ سنسنگ کی Imageries تیار ہوتی ہیں۔ اس نئی تکنیک سے پورا ملک مستفید ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) لانچ وہیکل جیسے PSLV اور GSLV بناتا ہے۔ حیدرآباد کی نیشنل ریموٹ سنسنگ ایجنسی (NRSA) ریموٹ سنسنگ کے حاصل شدہ Digital اعداد و شمار کی Processing اور Analysis کرتی ہے، جن سے Imageries تیار ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں ریموٹ سنسنگ تکنیک سے ملے اعداد و شمار Analysis کی ٹریننگ دینے کے لیے دہرہ دون کا انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ریموٹ سنسنگ (Indian Institute of Remote Sensing-IIRS) بھی بہت مشہور ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی زیادہ تر ریاستوں میں ریموٹ سنسنگ کے علاقائی مراکز بھی ٹریننگ دینے کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ سارے ادارے ریموٹ سنسنگ اور خلائی سائنس کی ترقیات میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جس سے ہندوستان کا شمار خلائی سائنس کے ترقی یافتہ ممالک کی صف اول میں ہوتا ہے۔

46-Nishat Apartment
Near Shamshad Market
A.M.U., Aligarh-202 002.

□□□

مجموعۂ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت: 268/- روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110 066

محمد خلیل

نینو ٹیکنالوجی

نینو ٹیکنالوجی گریک زبان کے لفظ 'نینو' سے لیا گیا ہے جس کے معنی مہین یا چھوٹے کے ہیں۔ یہ نام ایک جاپانی سائنسداں نے 1976 میں دیا تھا۔ پھر تقریباً دس سال کے بعد 1986 میں سائنسدانوں کی دلچسپی نینو ٹیکنالوجی کے اہم میدان کی جانب ہوئی جس کا سہرا مغربی جرمنی کے سائنسداں گارڈ بیننگ اور سوئٹزر لینڈ کے ہیمن ریچ رورر کو جاتا ہے جن کی مشترکہ کوششوں سے اسکیننگ ٹنلنگ مائیکرو اسکوپ تیار کیا جا سکا۔ اسی مائیکرو اسکوپ کی مدد سے جوہر (Atom) اور مالیکولس کی بناوٹ کا پہلی مرتبہ گہرائی سے تحقیقی مطالعہ کیا جا سکا۔ اس گراں قدر تحقیق کے لیے ان سائنسدانوں کو نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔

نینو میٹر ایک یونٹ ہے جو ایک میٹر کے کروڑویں حصے کے برابر ہوتی ہے۔ ایک سے سو نینو میٹر کو 'نینو ڈومین' کہا جاتا ہے۔ جب ایٹم اور مالیکیول نینو علاقے کو متاثر کرتے ہیں تو ان میں نئی تبدیلیاں ہوتی ہیں جو انسان کے لیے کئی طرح سے مفید ہوتی ہیں۔ نینو علاقے کو متاثر کرنے والی اس تکنیک کو ہم نینو ٹیکنالوجی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک نینو ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کی بناوٹ کا دس گنا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نینو ٹیکنالوجی میں کس قدر باریک سطح پر کام کیا جاتا ہے۔ نینو ٹیکنالوجی کے بنیادی طریقوں کے استعمال سے کینسر، ایڈس، ذیابیطس (ڈائبیٹیز) اور کئی دوسری بیماریوں کو ختم کرنے اور علاج میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

نینو ٹکنالوجی کو استعمال میں لانے کے لیے مادّوں کی جسامت چھوٹی کر کے نینو ڈومین بنا لیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے تجرباتی اشیا کی سبھی خصوصیات میں الیکٹریکل تھرمل اور آپٹیکل وغیرہ کی ہر سطح پر تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے مادّوں کے لیے سرفیس ٹو والیوم ریشیو (Surface to Volume Ratio) اہم ہوتا ہے اور زیادہ تر ایٹم سطح میں آ کر مادّوں کو زیادہ کارگر (ایکٹیو) بناتے ہیں۔ اسی اثر کے نتیجے میں مادّوں کی عمل کی کارکردگی بدلتی ہے جس کی وجہ سے نئے کیٹیلسٹ، مکس میٹل اور کمپوزٹ سینسر کی فراہمی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

نینو ٹیکنالوجی تیار کرنے کے لیے ہمیشہ دو طریقوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے پہلے بڑے سے چھوٹا کرنے کا طریقہ اور دوسرے چھوٹے سے بڑا کرنے کی تکنیک۔ دونوں تکنیکوں کے آخر میں ایک تعجب خیز نینو ٹیکنالوجی تیار کی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز کی تعمیر خاص طور سے ایٹم کے ذریعے ہوتی ہے اور اس کی بناوٹ بھی اس میں موجود جوہر (Atom) سے جڑی ہوئی مختلف کیمیائی عملیات کی بناوٹ پر منحصر کرتی ہے۔ یہ بناوٹ بار بار بدلی جا سکتی ہے لیکن ضرورت ہے صرف ان کے آپسی ردّ عمل میں کچھ تبدیلی کرنے کی۔ نینو مادّہ ایٹم سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی کھینچنے کی قوت اس سے زیادہ ہونا ایک حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نینو میٹریل (Material) بے حد ہلکے، مضبوط، آر پار دکھائی دینے والے اور اپنے بنیادی میٹریل سے پوری طرح مختلف ہوتے ہیں۔ نینو ٹیکنالوجی سے تیار شدہ میٹریل کی جسامت انسانی بال کے تقریباً پچاس ہزارویں حصے کے برابر ہے۔ نینو ٹیکنالوجی کا استعمال امریکہ کی عام زندگی میں کثرت سے ہو رہا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں ابھی نینو ٹیکنالوجی کی ابتدا ہی ہوئی ہے اور سائنسی ماہرین اس میدان میں مسلسل تحقیق میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی صنعتی بازار میں ابھی نینو ٹیکنالوجی پر منحصر چیزیں بازار میں نظر نہیں آ رہی ہیں لیکن جلد ہی اس کے اثرات کو ہندوستانی بازاروں پر دیکھا جا سکے گا۔

ترقی کے مختلف میدانوں میں نینو ٹیکنالوجی کا اہم رول ہے۔ خاص طور پر کمپیوٹر سائنس اور طبی میدان میں نظر آتا ہے۔ کمپیوٹر کے میدان میں اس کے ذریعے انقلاب آنے کے امکان پیدا ہو گئے ہیں۔ سپر کمپیوٹر اسی نینو ٹیکنالوجی کا ہی نتیجہ ہے۔ اس میں کنکٹر (Conector) کی شکل میں نینو وائر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وائر کے لگتے ہی کمپیوٹر کی میموری (Memory) اور رفتار تقریباً دس لاکھ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس تکنیک کا استعمال اب کمپیوٹر چپ (Chip) کے سرکٹ تیار کرنے میں بھی کیا جانے لگا ہے جو عام چپ کے مقابلے اچھے نتائج فراہم کرتی ہے۔

نینو ٹیکنالوجی نے طب کے میدان میں بھی لامحدود امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ نینو ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کیے گئے آلات سے صحت کے میدان میں بڑی اُمیدیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کمپیوٹنگ میں ہو رہی ترقی مختلف قسم کے Genes کو سمجھنے میں خاص طور پر مددگار ثابت ہوگی۔ یہ معلومات دواؤں کی تیاری ان سے ہونے والے فائدے اور مختلف بیماریوں کے علاج میں اہم کردار ادا کرے گی۔ نینو ٹکنالوجی کی مدد سے اُونچی توانائی کی صلاحیت رکھنے والے مادّوں کی تیاری عمل میں آ سکے گی جو انسانی جسم میں پیوست کی جا سکے

گی۔ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے ایسی مشینوں کی تیاری کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں جو انسانی جسم میں خون کو بھیجنے والی نسوں کے ذریعے بیمار حصوں تک یا کینسر کی گانٹھوں تک پہنچے گی اور بیمار خلیوں کو ختم کر دے گی۔ طبی سائنس کے میدان میں بیمار خلیوں کو ختم کر دے گی۔ ادویاتی میدان میں بھی نینو ذرات سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ کچھ دواؤں کے ذرّات کی بناوٹ اس قدر بڑی ہوتی ہے کہ وہ ٹیومر یعنی رسولی میں داخل نہیں ہو پاتے جس سے دوائیں اپنا پورا اثر نہیں دکھا پاتیں۔ ان دواؤں کو اگر نینو ذرات میں تبدیل کر دیا جائے تو دواؤں کے اثرات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ نینو سے حیاتیاتی ادویات کے کئی میدانوں میں فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان میدانوں میں اسپتالوں، تجربہ گاہوں، اور یہاں تک کہ انسانی جسم کے اندر بھی یہ استعمال میں لائے جانے والے لینسر (Lenser) دواؤں کو جسم کے کسی خاص حصے تک پہنچانے والے طریقے، مصنوعی اعضا کی تیاری کے کام آنے والی چیزوں اور نئے قسم کی دوائیں شامل ہیں۔

حال ہی میں سائنسدانوں نے ایسی کاربن نلیاں تیار کی ہیں جن کی گولائی انسان کے بال کے پچاس ہزارویں حصے کے برابر ہے۔ ان نلکیوں کو Drug delivery کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نینو ذرّات پر منحصر Drug delivery طریقے سے ذیابیطس (Diabetes) کے مریض انسولین کو انجکشن کی بجائے عام کیپسول کی شکل میں لے سکیں گے۔ نینو ذرّات والا یہ کیپسول جسم کے اندر ہی کام انجام دے گا جہاں اس کی ضرورت ہوگی۔ انسولین کے علاوہ کینسر کو روکنے والی دوا نینو کیپسول بھی اس طریقے کے ذریعے دی جا سکے گی۔ نینو ٹیکنالوجی پر منحصر کیپسول اینڈوسکوپی (Endoscopy) آلے کے ذریعے آنتوں کی بیماریوں کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ طریقہ بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ مریض اس کیپسول کو منہ سے نگل لیتا ہے۔ نگلنے کے بعد اس میں لگا سینسر فی سکنڈ کے حساب سے اشارے بھیجنا شروع کر دیتا ہے۔ ان اشاروں کو جسم میں لگے آٹھ تاروں کے ذریعے استعمال کر کے Compact میں ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ ان تصویروں کا رنگین پرنٹ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس عمل میں کوئی ردّ عمل نہیں ہوتا اس لیے حاملہ عورتوں کی آنتوں میں تکلیفوں کا پتہ لگانے کے لیے بھی اس تکنیک کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس آلے کے ذریعے آنت کے اندر بڑھ رہے کئی خطرناک امراض کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے ایک ڈی این اے کی پہچان کرنے والے طریقے کو دریافت کر لیا ہے۔ اس سے جینی اور موروثی امراض کا فوراً پتہ چل جائے گا۔ اس میں نینو تکنیکوں اور الکٹروڈس دونوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ فی الحال ڈی این اے پہچان کے لیے پالی مَتریز چین ری ایکشن یعنی پی سی آر طریقے کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس میں وقت بہت لگتا ہے اور غلط نتیجوں کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ نینو تکنیک پر منحصر DNA ٹیسٹ کرنے والے سائنسدانوں کے بقول ان کا ٹیسٹ PCR طریقے سے تقریباً دس گنا تیز ہے۔ اور صحیح نشاندہی کرنے کے معاملے میں ایک لاکھ گنا بہتر — نینو ٹیکنالوجی کا استعمال بیماریوں کے ابتدائی دور میں پتہ لگا کر جلد علاج میں کام آنے والے طریقوں کی تیاری میں کیا جا سکتا ہے۔ نینو کے ذریعے ایسے اعضا بنائے جا سکتے ہیں جو جسم کی تبدیل شدہ ضرورتوں کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کر سکیں اور ان کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیں۔ اس طرح دواؤں کی تیاری کے میدان میں بھی نینو ٹیکنالوجی سے کئی امید افزا امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

H- 51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

□□□

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے ان دانشوروں میں ہوتا ہے جو ایک نثر گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوقِ جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپئے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہرِ لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپئے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، وِنگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

تحریر: مانک پانڈے
ترجمہ: رئیس احمد

ماحولیاتی توازن اور گدھ

'گدھ' نظام قدرت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ قدرت کی منفرد کاریگری کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جس کے بغیر روئے زمین پر زندگی کا تصور ممکن ہی نہیں، لیکن ان دنوں۔ 'گدھ' کے زندہ رہنے کے امکانات پر ہی سوالیہ نشان لگ گیا ہے جس کے باعث ہمارے لیے ان خطرات سے باخبر اور ہوشیار رہنے کا وقت آ گیا ہے جو گدھ کے خاتمے پر ہمیں ہر جانب سے گرفت میں لے سکتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں ان کی تعداد مسلسل کم ہوئی ہے اور ایک وقت تو لگنے لگا تھا کہ گدھ شاید معدوم ہی ہو گئے ہیں۔

زمین پر ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے ضمن میں۔ گدھ کی بڑی اہمیت ہے۔ گدھ، بیکٹیریا اور مکھی ہمارے غذائی سلسلے (Cycle) کا ڈی کمپوزر کہلاتے ہیں۔ جس طرح شیر ہمارے غذائی سلسلے کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے بالکل اسی طرح یہ تینوں اس کی سب سے ادنیٰ کڑی ہیں۔

بلاشبہ زندگی کے سفر کا پہیہ انھی تینوں پر منحصر ہے کیونکہ یہ تینوں جاندار قدرت کی جانب سے ہمیں میسر خاص درجے کے ڈی کمپوزر ہیں جن کی بدولت ماحولیات کو متوازن رکھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ تینوں جاندار بیماریوں کو روکنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمارا ملک زراعت پر مبنی ہے جہاں جانوروں اور مویشیوں کی تعداد تقریباً 60 کروڑ ہے۔ اس میں چار پانچ کروڑ جانور اور مویشی ہر سال مر جاتے ہیں۔ مزید برآں ہمارا ملک گوشت خور نہ ہونے کے سبب مویشیوں اور جانوروں کی لاشوں کو شہروں اور قصبات کے باہر پھینک دیا جاتا ہے، جہاں چمڑے کا کام کرنے والے ان کے اوپر سے چمڑا اتار لیتے ہیں۔ اس کے بعد شروع ہوتا ہے قدرت کا ایک انوکھا عمل — ہزاروں گدھ ایک مردہ بیل کے گوشت کو بیس منٹ میں صاف کر دیتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب کوئی جانور یا مویشی مرتا ہے تو اس کے اوپر سب سے پہلے بیکٹیریا کا حملہ ہوتا ہے، دوسرا حملہ اس مردہ جسم پر گدھوں کا ہوتا ہے۔ گدھوں کے ذریعے جو باقی ماندہ گوشت ہڈیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اس میں مکھیاں اپنے انڈے دیتی ہیں۔ ان انڈوں سے لاروا نکلتا ہے جو باقی ماندہ گوشت کو کھا جاتا ہے۔ قدرت کے عطا کردہ یہ تینوں ڈی کمپوزر 48 گھنٹے کی مدت میں اس عمل کو انجام دے دیتے ہیں یعنی جانور کی لاش کو مٹی میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جب یہ عناصر مٹی میں مل جاتے ہیں تو ان میں بچی ہوئی حرارت کے عناصر سے زمین پر گھاس پیدا ہو جاتی ہے جسے گائے، ہرن، خرگوش اور بھیڑ بکریاں کھاتی ہیں اور انھی جانوروں کو کھا کر شیر زندہ رہتا ہے لیکن جب شیر مر جاتا ہے تو قدرت کے یہی تینوں ڈی کمپوزر اس کی لاش کو بھی ٹھکانے لگاتے ہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گدھ کا وجود ہمارے لیے کتنا ضروری ہے، لیکن کم فہمی کے باعث گدھوں کی تعداد میں مسلسل کمی آ رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب ہمارے ملک میں گدھوں کی تعداد دنیا کے دیگر ممالک کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ اور یہ تعداد یہاں زیادہ مویشی ہونے کے باعث ہی تھی۔ گدھ ایک ایسا ڈی کمپوزر ہے جو ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے علاوہ ہمارے پانی اور پانی کے چشموں کو بھی صاف کرتا ہے۔ لیکن گذشتہ دس برسوں سے گدھوں کی تعداد میں اچانک کمی آ گئی ہے۔ سائنس دانوں کو سب سے پہلے یہ شبہ ہوا کہ گدھوں پر وائرس کا حملہ ہو گیا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بعد ازاں کیڑے مارنے والی دواؤں کی جانچ ہوئی لیکن اس کے بعد بھی کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ ان کی وجہ سے گدھوں کی تعداد میں کمی آ رہی ہے لیکن 2003 میں پیراگرین فنڈ نامی ایک غیر سرکاری ادارے اور بعض بین الاقوامی سائنس دانوں نے پاکستان میں پوشیدہ اس قاتل کو ڈھونڈ ہی نکالا۔

یہ قاتل ایک عام درد کی دوا ڈائکلوفینک ہے جس کا استعمال کسانوں کے ذریعے جانوروں کے درد اور بخار میں کیا جاتا ہے۔ ڈائکلوفینک کے استعمال کے دوران جب جانور مر جاتا ہے اور اس مرے ہوئے جانور کو جب گدھ کھاتا ہے تو اس دوا کا براہ راست اثر اس کے گردے پر پڑتا ہے۔ اگر اس کے استعمال کے بعد مرے ہوئے جانوروں کا گوشت گدھ ایک بار بھی کھا لیتا ہے تو تین دن کے اندر اس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس دوا کے مضر اثرات

کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں ہندوستان، نیپال اور پاکستان میں آٹھ کروڑ پچاس لاکھ سائنس دانوں کے مطابق تینوں ممالک میں دو تین ہزار سے زیادہ گدھ نہیں بچے ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں مویشیوں کی لاشیں گاؤں اور شہر کے باہر سڑتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ایسے کتوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے، جو مردہ جانوروں کا گوشت کھانے کے بعد گاؤں میں گھس آتے ہیں اور کبھی کبھار تو بچوں کو بھی کاٹ لیتے ہیں جس سے ریبیز کے معاملوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کچھ دنوں پہلے بین الاقوامی شہرت یافتہ کربیٹ نیشنل پارک کے قریب دیولی نامی گاؤں میں اینتھریکس پھیلنے کی خبر آئی ہے۔ گدھوں کی تعداد میں ہو رہی کمی کے باعث جب جانوروں کی لاشیں سڑنے لگتی ہیں تو ان میں سے ہزاروں کی تعداد میں مضر بیکٹیریا پیدا ہوتے ہیں جن سے بیماری پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں مردہ جانوروں کی لاشوں سے اینتھریکس نامی بیماری پھیل سکتی ہے۔ ملک میں برڈ فلو کے پھیلنے سے ہی افراتفری کا ماحول بن جاتا ہے اگر اینتھریکس پھیلا تو پھر حالت کیا ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوگا۔ 17 مارچ 2005 کو وزیر اعظم نے ایک ہدایت جاری کی تھی کہ ایسی مضر دواؤں کو بازار سے ہٹایا جائے۔ لیکن ہنوز ڈرگ کنٹرولر جنرل آف انڈیا اور وزارت زراعت کا اینیمل ہسبینڈری شعبہ اس پر کوئی فیصلہ نہیں لے سکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فیصلہ لیتے لیتے گدھ روئے زمین سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائیں جس کا خمیازہ پوری انسانیت کو اٹھانا پڑے۔

اس جانب غور و فکر کی مزید ضرورت ہے کہ جب ڈائیکلوفینک نامی دوا کا متبادل میلوکسی کیم نامی دوا بازار میں دستیاب ہے تب بھی یہ ضرر رساں دوا جو کہ گدھوں کے لیے نقصان دہ ہے، بازار سے کیوں نہیں ہٹائی جا رہی ہے۔ متبادل دوا کی قیمت محض دس روپے زیادہ ہے۔ کیا ہم ماحولیات میں توازن قائم رکھنے کے لیے دس روپے زیادہ خرچ نہیں کر سکتے؟

(بشکریہ "ہندوستان" دہلی، 28 اپریل 2006)

□□□

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔

تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

حکیم اشہر قدیر

آشوب چشم قشی

ہندوستان میں جولائی تا ستمبر برسات کا موسم ہوتا ہے۔ بالخصوص شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں یہ موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت جہاں درجۂ حرارت 35° سے 40° رہتا ہے وہیں برسات کی وجہ سے ہوا میں نمی کا تناسب بڑھ جاتا ہے اور موسم کا مزاج گرم تر ہو جاتا ہے۔ ماحول میں گرمی اور تیزی ہونے کی وجہ سے بیماری پھیلانے والے جاندار جیسے مکھی، مچھر اور دیگر خورد بینی اجسام (Microbes) جیسے بیکٹیریا، وائرس، پروٹوزوا تیزی سے پیدا ہوتے ہیں اور مختلف بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں نزلہ، کھانسی، بخار، خسرا، ملیریا، ڈینگو اور آنکھوں کی بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔

عام طور پر اگست و ستمبر کے مہینے میں آشوب چشم جس کو عرف عام میں آنکھ دکھنا یا آنکھ آنا اور جدید انگریزی اصطلاح میں Conjunctivitis کہتے ہیں، کے مریضوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بیماری وبائی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پورا کا پورا گاؤں اور شہر اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس بیماری میں آنکھوں میں سرخی، کھٹک، سوجن، درد، چبھن اور روشنی سے تکلیف کی شکایات سامنے آتی ہیں۔

حالانکہ آشوب چشم کے مختلف اسباب ہیں لیکن وبائی آشوب چشم کا سبب وائرس ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو آشوب چشم قشی (Viral Conjunctivitis) سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ آشوب چشم قشی مرض کو پیدا کرنے میں وائرس کی تقریباً آٹھ سے نو اقسام حصہ لیتی ہیں لیکن ان سبھی کے نتیجے میں ہونے والے آشوب چشم کی علامات کم و بیش وہی ہوتی ہیں جو بیان کی گئیں۔

اس مرض کی ابتدا میں مریض کو اچانک محسوس ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ میں کھٹک اور بے چینی پیدا ہوگئی ہے جس طرح کوئی تنکا یا ذرّہ آنکھ میں پڑ جانے سے محسوس ہوتا ہے۔ مریض بے چین ہو کر آنکھ کو ملتا ہے جس سے بے چینی اور بڑھ جاتی ہے اور ایک دو گھنٹے کے بعد آنکھ سرخ ہو جاتی ہے اور سوج جاتی ہے۔ مرض جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو پپوٹوں کا ورم اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آنکھ کھولنا دشوار ہو جاتا ہے اور روشنی میں نکلنے سے آنکھوں کو ایذا پہنچتی ہے۔ عموماً پہلے ایک آنکھ متاثر ہوتی ہے اور پھر جلدی ہی دوسری آنکھ میں یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس مرض کی آمد اس طرح بھی ہوتی ہے کہ انسان اچھا بھلا رات میں سویا اور جب صبح کو اٹھا تو معلوم ہوا کہ آنکھ میں سرخی اور ورم ہے۔ اس بیماری میں آنکھ سے رطوبت کا اخراج بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے پلکیں آپس میں چپک جاتی ہیں اور آنکھیں نہیں کھل پاتیں۔ ایسا عموماً بچوں میں ہوتا ہے۔ ویسے اس مرض میں عمر اور جنس کی کوئی قید نہیں، یہ مرض کسی کو بھی ہو سکتا ہے۔

اس مرض کا علاج بیان کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ اس سے حفاظت کے طریقے بیان کر دیے جائیں کیونکہ معمولی احتیاط برتنے سے یقینی طور پر اس بیماری سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ پہلے تو اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ مریض کی سرخ آنکھ دیکھنے سے تندرست شخص اس بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ بلکہ اس بیماری کے پھیلنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک بیمار کی آنکھ سے تندرست کی آنکھ تک کسی ذریعے سے وائرس پہنچ جائے۔ چنانچہ مریض کا رومال، تولیہ اور تکیہ وغیرہ استعمال کرنے سے یہ مرض تندرست شخص تک پہنچتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مریض کے استعمال میں آنے والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔ اس کے علاوہ ضروری ہے کہ تندرست شخص وبائی موسم میں بغیر ضرورت اپنی آنکھوں پر ہاتھ نہ لگائے کیونکہ جب کوئی شخص اپنے ہاتھوں سے مریض کی چیزیں چھوتا ہے اور پھر اس کے ہاتھ اس کے چہرے اور آنکھوں پر لگتے ہیں تو وائرس آنکھوں میں داخل ہو کر مرض کا سبب بن جاتا ہے۔ خاص طور سے کسی ضرورت کے تحت اگر کسی اسپتال یا کسی ڈاکٹر کے کلینک پر جانا ہو تو بہت ضروری ہے کہ وہاں سے گھر آ کر فوراً ہاتھ صابن سے دھو لیں۔ وبا کے زمانے میں اگر دن میں دو تین مرتبہ صاف پانی اور

صابن سے منہ کو دھویا جائے تب بھی اس بیماری سے بچا جا سکتا ہے۔ اگر آنکھوں کو صاف اور ٹھنڈے پانی سے دو دو گھنٹے بعد دھوتے رہیں تو اس مرض کا شکار ہونے کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

اس بیماری سے دوسرے لوگوں کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مریض تندرست آدمیوں سے دور رہے اور اپنے آپ کو دو تین روز کے لیے سب سے علاحدہ کرلے۔ بچوں کے سلسلے میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ اگر کوئی بچہ اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کو اسکول بالکل نہیں بھیجنا چاہیے ورنہ وہ دوسرے بچوں کو بھی اس مرض میں مبتلا کر دے گا۔ اسکول کے منتظمین کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ متاثرہ بچے کو اپنی طرف سے چھٹی دے دیں تاکہ دیگر بچوں کو اس وبا سے محفوظ رکھا جا سکے۔ عام طور سے یہ مرض چھ سے سات دن میں خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن اگر کچھ تدابیر اور علاج اختیار کرلیا جائے تو اس کی شدت اور تکلیف میں نہ صرف کمی آئے گی بلکہ اس مرض کی مدت بھی کم ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مریض دن میں دو تین مرتبہ اپنی آنکھوں کو صاف پانی سے دھوئے اور پانی کو اُبال کر ٹھنڈا کر کے اور پھر اس میں بورک پاؤڈر (Borik Powder) ایک چٹکی ڈال کر اس محلول سے آنکھوں کو دھوئے۔ اگر بورک پاؤڈر دستیاب نہ ہو تو پانی میں نیم کی پتیاں ڈال کر اُبال لے اور پھر پانی ٹھنڈا ہونے کے بعد اس سے آنکھوں کو دھوئے۔

دوا کے طور پر عرق گلاب کے دو دو قطرے دن میں تین چار بار ڈالے تو اس سے مرض میں بہت جلد کمی آ جاتی ہے اور آنکھوں کی سرخی اور ورم غیر معمولی طور پر کم ہو جاتا ہے۔

اگر یہ مرض دس دن سے زیادہ مدت تک قائم رہے اور آنکھوں سے گاڑھی اور چپچپی رطوبت خارج ہوتی رہے تو کسی مستند ڈاکٹر سے رجوع کریں تاکہ وہ آنکھوں کا معائنہ کرے اور حسب ضرورت دوا تجویز کرے۔

157/A, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar
New Delhi-110025

□□□

خطباتِ آزادی (حصہ اوّل)

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں، سی آر داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔

صفحات: 580، قیمت-/280 روپے

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس

مترجم: فضل حسنین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بے حد سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا قالب عطا کیا ہے۔

صفحات: 516، قیمت:-/256 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: چھما شرما
ترجمہ: جاوید اقبال

میرے بچے، تمھارا پتہ کیا ہے؟

اکثر وزارت سماجی فلاح و بہبود کی طرف سے اخباروں میں اشتہار شائع ہوتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے، گمشدہ بچی یا گم شدہ بچہ۔ ان میں سے کیا پتہ کتنے کے ماں باپ ان اشتہاروں کو دیکھتے ہیں، کتنے گم شدہ بچے اپنے ماں باپ سے مل پاتے ہیں۔ اکثر فلموں میں ہم کھوئے ہوئے بھائی بہنوں کا بہت بڑے ہونے پر ملن دیکھتے ہیں۔ مگر عام زندگی میں ایسا مشکل سے ہوتا ہے۔ قومی کمیشن برائے حقوق انسانی نے ان گم شدہ بچوں پر حال ہی میں ایک رپورٹ جاری کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر سال تقریباً گیارہ ہزار بچے گم ہو جاتے ہیں۔ کافی تلاش کرنے پر بھی یہ بچے پھر نہیں ملتے۔ ان کے گھر والے پوری زندگی سوچتے رہتے ہیں کہ شاید ان کے کھوئے ہوئے بچے کبھی نہ کبھی گھر واپس لوٹ آئیں گے۔ لیکن ایسا بہت کم ہو پاتا ہے، اکثر تو ماں باپ ان بچوں کو دوبارہ دیکھنے کی آس دل میں لیے دنیا سے بھی رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ بچے دوبارہ اپنے گھر واپس نہیں آنا چاہتے، لیکن وہ ایسے حالات میں پھنس چکے ہوتے ہیں کہ چاہ کر بھی نہیں آپاتے۔ یہ بچے بھکاریوں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ لوگ رحم کھا کر انھیں زیادہ بھیک دے دیں، اس لیے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انھیں اپاہج بنا دیا جاتا ہے۔ انھیں گھریلو نوکر کی شکل میں فروخت کر دیا جاتا ہے یا پھر بچہ مزدور بنا کر ایسے کاموں میں لگا دیا جاتا ہے، جو ان کی صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بچے گھر والوں سے دور ہوتے ہیں، اس لیے کوئی ان کی خبر بھی نہیں لیتا۔ کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جب سے سیاحت میں اضافہ ہوا، ساحلی علاقوں میں کم سن بچوں کی جسم فروشی میں بھی اضافہ ہوا ہے، اس لیے جسم فروشی میں ملوث افراد ایسے بچوں اور بچیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک بار بچے کو اس دلدل میں ڈال دیا جائے، تو پھر وہ کبھی اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ حقوق انسانی کمیشن نے کم سن بچوں کی جسم فروشی کے اضافے پر خاص طور سے تشویش کا اظہار کیا ہے، خاص طور سے گم ہوئے بچوں کو جسم فروشی کے گھناؤنے کاروبار میں ڈالے جانے سے کمیشن خاصا فکر مند ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچوں کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی کوئی بچہ گم ہو، پورے ملک میں ریڈ الرٹ کا اعلان کر دیا جائے، جنگی پیمانے پر اس کی تلاشی کی مہم شروع کر دی جائے۔ سرکار ان بچوں کو تلاش کرنے کے لیے عدالتوں، تھانوں اور باز آبادکاری مراکز میں ایسے کارندوں کو منتخب کر سکتی ہے کہ جیسے ہی کوئی گم شدہ بچہ ملے، اسے نہ صرف تحفظ دیا جائے، بلکہ بچے کے ذریعے دی گئی اطلاعات کی بنیاد پر جلد سے جلد اسے گھر والوں سے ملانے کی کوشش کی جائے۔ صرف ہندوستانی ہی نہیں پڑوسی ملک جیسے بنگلہ دیش یا نیپال کے بچوں کو ہندوستان میں لاکر اونچی قیمت پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ پھر انھیں جسم فروشی کے دھندے میں لگا دیا جاتا ہے۔ اگر ان ممالک کی حکومتیں تہیہ کر لیں تو بچوں کی اسمگلنگ کو روکنا ممکن ہے۔ قارئین کو اونٹ دوڑ میں استعمال کیے جانے والے بچوں کے متعلق معلوم ہوگا۔ آخر بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے سعودی عرب کی حکومت کو اس دوڑ میں بچوں کا استعمال بند کرنا پڑا، تو کیوں نہیں حکومتیں اس عزم کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کو جسم فروشی اور خطرناک بیماریوں سے بچایا جا سکے۔

ہر ریاست کو اپنے یہاں سے بھاگنے والے بچوں کی خاص رپورٹ تیار کرانی چاہیے۔ آخر بچے گھر سے بھاگتے کیوں ہیں؟ زیادہ تر بچے امتحان میں ناکامیاب ہونے کے ڈر سے بھاگتے ہیں۔ بہت سے بچے بڑوں کی مار پیٹ اور ڈانٹ سے بھاگتے ہیں۔ کچھ کو باہر کی دنیا دل کش نظر آتی ہے اس لیے وہ گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی گھر سے پیسے بھی چرا لے جاتے ہیں اور پیسے ختم ہونے پر ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور ایسے میں ان بچوں کی تاک میں لگے افراد انھیں اپنے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں۔ اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سرکاری یا غیر سرکاری تنظیموں کی کوششوں سے جن بچوں کی باز آبادکاری کا انتظام کیا گیا، کیا وہ حقیقت میں وہاں رہ پائے۔ یا وہ صرف کاغذی اعلانات ہی رہے؟ کیا جسم فروشی میں ملوث بچوں کو ان کے ماں باپ نے قبول کیا یا وہ دوبارہ پھر اسی دلدل میں پھنسنے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کوئی بھی بچہ اپنی مرضی سے اس جہنم میں نہیں جانا چاہتا۔ ہم بڑے ہی اسے کسی نہ کسی مصیبت میں دھکیلتے ہیں اور اس پر واپسی کے دروازے بھی بند کر دیتے ہیں۔ بچوں کے لیے خاندان کا سہارا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے، لیکن اگر بچہ ایک بار اس سہارے سے مختلف وجوہات کی بنا پر محروم ہو جائے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو جاتا ہے۔

(بشکریہ ہندوستان' نئی دہلی 28 اپریل 2006)

□□□

بھرت جھن جھن والا

مفاد عامہ اور حقوق انسانی

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے تین نمائندوں نے سردار سرودر باندھ کی اونچائی نہ بڑھانے کا مشورہ حکومت ہند کو دیا ہے۔ ان میں پہلے ہیں حقوق انسانی صورتحال پر خصوصی نمائندے انا جیلانی، دوسرے ہیں باز آباد کاری و رہائش کی صورتحال سے متعلق خصوصی نمائندے نیلول کوٹھاری اور تیسرے ہیں قبائلی حقوق پر نمائندہ روڈولفو اسیٹون ہیکمین۔ ان تینوں نے حقوق انسانی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے۔ پہلی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کو سرکار کے ذریعے کمزور عوام پر کیے جارہے سرکاری مظالم کی بہت فکر ہے۔ عوام کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کو روکنے کے لیے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے ان نمائندوں کو مقرر کیا ہے لیکن گہرائی سے جانچ کرنے پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کا مقصد غریب ممالک کو اقتصادی ترقی سے محروم رکھنا اور امیر ممالک کے ذریعے ان کا مسلسل استحصال یقینی بنانا ہے۔

1948 کے حقوق انسانی پر عالمی اعلان کی سیاست کو سمجھنا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ اعلان میں سیاسی حقوق کو بین الاقوامی سطح پر نافذ کیا گیا ہے جبکہ اقتصادی حقوق کو قومی سطح پر۔ شق 1 میں کہا گیا ہے کہ بھی انسان مساوی ہیں اور ان کے حقوق بھی برابر ہیں۔ شق 3 میں کہا گیا ہے کہ بھی کو زندگی، آزادی اور تحفظ کا حق ہے۔ شق نمبر 18,19 اور 20 میں اظہار خیال، رائے اور جلسہ کرنے کا اختیار ہے۔ یہ حق بھی سیاسی حق ہے۔ غریب بھی ان حقوق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ جیسے سردار سرودر باندھ کے سبب اجڑے ہوئے لوگ اظہار رائے، جلسہ منعقد کرنے، بھوک ہڑتال وغیرہ پر بیٹھنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان حقوق کا دائرہ گلوبل ہے۔ انھیں کسی ملک کی خاص صورت حال کے مطابق محدود نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے آرٹیکل 1 میں کہا گیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں، یعنی نرمدا کے اجڑے ہوئے شخص کو اظہار خیال کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ امریکہ کی مسیسپی ندی کے اجڑے ہوئے شخص کو۔

ان اختیارات کے گلوبل دائرے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھیں فراہم کرانے کی ذمہ داری بھی گلوبل ہے۔ اگر کوسوو، عراق کے کردستان یا افغانستان میں سرکار عوام کے حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہے تو عالمی برادری ان کے تحفظ کے لیے فوج بھیج سکتی ہے۔ یعنی ان حقوق انسانی کی بحالی کے لیے طاقتور ممالک کمزور ممالک پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اقتصادی حقوق انسانی کی صورت حال قطعی مختلف ہے۔ شق نمبر 13 میں کہا گیا ہے کہ آزادانہ آمد و رفت کا اختیار ہر ملک کی سرحد کے اندر حاصل ہوگا۔ ایک انسان دوسرے ملک میں جانا چاہے تو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ شق نمبر 21(2) میں کہا گیا ہے کہ اپنے ملک کی عوامی سہولیات کا استعمال کرنے کا حق ہر شخص کو ہے۔ ہر ہندوستانی کو حق ہے کہ وہ ہندوستان کی سڑک پر چلے، اسے امریکہ کی سڑک پر ٹہلنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ امریکی سرکار کو سڑک کے استعمال کے لیے ادائیگی کرے تو بھی اس سہولت کو حق کی شکل میں نہیں مانگ سکتا ہے۔ شق نمبر 22 میں کہا گیا ہے کہ سماجی تحفظ کا اختیار ملک کے وسائل کے مطابق ہی حاصل ہوگا۔ ان التزامات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقوق انسانی ملک کی سرحد اور حالات کے مطابق محدود ہو جاتے ہیں۔

ملک کے حالات کے مطابق اقتصادی اختیارات محدود ہونے کا نتیجہ سمجھیے۔ ان اختیارات کی بحالی کے لیے ملک کی سرکار کو اپنے تمام شہریوں کو مکان وغیرہ مہیا کرانا ہوگا۔ سردار سرودر باندھ کے اجڑے ہوئے لوگوں کو پہلے مکان مہیا کرایا جائے گا پھر باندھ کی اونچائی بڑھائی جائے گی۔ انصاف کے نقطۂ نظر سے یہ مناسب ہی ہے۔ لیکن گلوبل سیاست کے اعتبار سے اس کی اہمیت کافی زیادہ ہے۔ مان لیجیے حکومت ہند کے پاس اجڑے ہوئے لوگوں کو پختہ مکان بنا کر دینے کے لیے پیسہ نہیں ہے۔ سرکار نے فیصلہ کیا کہ یہ اجڑے ہوئے لوگ پانچ سال تک جھونپڑی میں رہیں۔ پہلے باندھ بن جائے پھر باندھ سے ہوئی آمدنی سے انھیں پختہ مکان یا روزگار دیے جاسکتے ہیں۔ انگلینڈ نے اٹھارھویں صدی میں فیکٹریوں میں سرمایہ کاری کے لیے اپنے مزدوروں پر اسی طرح کے مظالم کیے تھے۔ امریکہ نے افریقہ سے درآمد شدہ سیاہ فام غلاموں کے ساتھ اسی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ ہندوستانیوں نے شدروں کو اسی طرح دولت جمع کرنے سے روکا۔ یہ ترقی کا معمول کا عمل ہے، لیکن حقوق انسانی اعلانیہ کے مطابق ہندوستان ترقی کے اس عمل کو نہیں اپنا سکتا ہے۔ اگر وہ پکا مکان بنا کر نہیں دے سکتا ہے تو اسے سردار سرودر باندھ بنانے کی آزادی نہیں ہے۔

غریب ممالک کی اقتصادی ترقی پر حقوق انسانی کی بندش لگا کر اقوام متحدہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مال کو امیر ممالک کو سستا بیچتے رہیں۔ جیسے

سردار سرودر نہ بننے سے گجرات کے میدانی علاقوں میں سافٹ ویئر پارک نہیں بن پائیں گے۔ ہماری سافٹ ویئر کی پیداوار کم رہے گی، نرمدا وادی میں کھیت نہیں ڈوبیں گے اور چاول کی پیداوار ہوتی رہے گی۔ ہم کم قیمت والے چاول کی پیداوار زیادہ اور زیادہ قیمت والے سافٹ ویئر کی پیداوار کریں گے۔ سافٹ ویئر جیسے زیادہ قیمت والے پیدا شدہ مال کے لیے امیر ممالک پر منحصر رہیں گے۔ ترقی یافتہ ممالک کے ذریعے سافٹ ویئر کی درآمد زیادہ ہوگی جسے امیر ممالک سپلائی کریں گے۔ اس طرح غریب ممالک طویل عرصے تک اپنے قدرتی وسائل امیر ممالک کو برآمد کرتے رہیں گے اور غریب بنے رہیں گے۔ یہ ہے اقتصادی حقوق انسانی کا آخری نتیجہ۔ اگر اقتصادی حقوق انسانی کا دائرہ بھی عالمی ہوتا تو یہ مسائل نہ پیش آتے۔ سردار سرودر باندھ کے اجڑے ہوئے لوگ امریکہ جاتے، امریکی سہولیات کا استعمال کرتے اور عالمی برادری سے اپنے سماجی تحفظ کے اختیار کا مطالبہ کرتے تب سردار سرودر باندھ بھی بنتا اور عالمی سطح پر مفاد عامہ کی بھی تکمیل ہوتی، لیکن حقوق انسانی اعلانیہ کا مقصد غریب لوگوں کا استحصال کرنا ہے اور اپنے استحصال کی مخالفت کرنے والوں پر حملہ کرنے کی بنیاد تیار کرنا ہے۔ اس لیے اعلانیہ میں اقتصادی اختیارات کو قومی سطح پر محدود کر دیا گیا ہے۔

ہندوستانی عوام کے مفادات کی بات کرنے والے میدھا پاٹکر جیسے حساس لوگوں کو اجڑے ہوئے لوگوں کے حقوق کے لیے ضرور لڑنا چاہیے کیونکہ ترقی کی موجودہ سمت مفاد عامہ کے خلاف ہے لیکن انھیں حقوق انسانی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ اس میں مفاد عامہ بھی نہیں ہے اور ترقی بھی ندارد ہے۔ ترقی کا ابتدائی مرحلہ یقینی طور پر عوام مخالف ہوتا ہے۔ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ترقی کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ساتھ مفاد عامہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ مفاد عامہ کے نام پر ترقی کو نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ ترقی کے فقدان میں مفاد عامہ پوری طرح ناممکن ہے۔

Lakshmoli, P.O. Maletha
Distt. Garhwal
Uttaranchal-249161

□□□

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی عشقی شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں وہ غالب سے ان کی محبت و عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دوسرے دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور جس کے بعض حالات اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کا جو حصہ میں سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے ڈاکٹر حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے متن نسخوں کو سامنے رکھ کر اسے اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-066 110

مصنف: جہانگیر
مترجم: اقبال حسین

''تو زک جہانگیری'' سے ماخوذ

حکایت بادشاہ و باغبان کی

آج کے دن بہادر خان صوبہ دار کی ایک عرض داشت سے معلوم ہوا کہ 1026ھ یعنی گزشتہ برس قندھار کے قرب و جوار میں چوہے اس قدر تھے کہ انھوں نے تمام فصل اناج اور کھیتی برباد کر دی اور پھل دار درختوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ کوئی پیداوار نہ ہو سکی۔ چوہوں نے اناج کی بالیاں کاٹ ڈالیں اور کھا گئے۔ جب کاشتکاروں نے اپنی فصل اکٹھا کی تاکہ اسے صاف کیا جائے تو ان میں سے مزید نصف برباد ہو گئی۔ اس طرح تقریباً ایک چوتھائی فصل ہی ہاتھ آئی۔ اسی طرح تربوزوں اور ان باغات کا حال ہوا جہاں یہ اگائے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد چوہے غائب ہو گئے۔

چونکہ میرے بیٹے شاہ جہاں نے اپنے بیٹے (اورنگ زیب) کی ولادت کا جشن نہیں منایا تھا، اس نے اجین میں جو اس کی جاگیر بھی ہے عرض داشت پیش کی کہ اسے جمعرات 30 تاریخ کو اپنے گھر پر تقریب منانے کی اجازت دی جائے۔ اسے اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر سکے۔ وہاں پورا دن تفریح میں گذرا۔ میرے ذاتی ملازمین جنھیں اس طرح کی دعوتوں میں داخلے کی اجازت ہے، جاموں کو لبریز کر کے شاد کام کیے گئے۔ میرا فرزند شاہ جہاں اس مولود مسعود کو میرے پاس لایا اور نذر میں جواہرات کا ایک خوان معہ زیورات اور 50 ہاتھی جس میں 30 نر اور 20 مادہ تھے، پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ میں اس کا نام رکھوں، انشاء اللہ کسی مبارک ساعت پر نام رکھا جائے گا۔ اس کے ہاتھیوں میں سات کو میرے ذاتی ہاتھی خانہ میں ڈال دیا گیا اور بقیہ کو فوجداروں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ نذر جو قبول کی گئی اس کی مالیت دو لاکھ روپیوں کی ہوگی۔

اسی دن عضدالدولہ (جمال الدین حسین انجو) اپنی جاگیر سے آیا اور قدم بوسی سے مشرف ہوا۔ اس نے نذر میں 81 مہریں ایک ہاتھی پیش کیے۔ قاسم خاں جسے میں نے بنگال کی حکومت سے برخاست کر دیا تھا، بلایا گیا اور اس نے تسلیمات پیش کرنے کے بعد 1000 مہریں نذر میں پیش کیں۔ جمعہ یکم آذر کو میں نے جرہ و باز کے شکار کا لطف اٹھایا۔ جب لشکر گذر رہا تھا تو ایک جوار کا کھیت ملا، گو کہ عام طور پر ایک خوشہ میں ایک ہی بالی ہوتی ہے، ان میں ہر ایک میں بارہ بالیاں تھیں۔ مجھے بہت حیرت ہوئی اور اس وقت مجھے بادشاہ اور باغبان کی حکایت یاد آئی۔

حکایت بادشاہ و باغبان کی

ایک بادشاہ ایک باغ کے دروازے پر گرمی کے دن میں آیا، اس نے ایک بوڑھے باغبان کو دروازے پر کھڑا دیکھا اور پوچھا کہ کیا باغ میں انار ہیں، اس نے جواب دیا، ہاں موجود ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے لیے ایک پیالہ انار کا شربت لائے۔ باغبان کی ایک بیٹی تھی جو حسن و جمال اور اچھی سیرت سے آراستہ تھی۔ اس نے اسے شربت لانے کا اشارہ کیا۔ وہ گئی اور فوراً انار کے شربت سے لبریز ایک پیالہ لائی اور اس پر چند پتیاں ڈال دیں۔ بادشاہ نے اس کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور پی گیا۔ تب اس نے لڑکی سے پوچھا کہ شربت کے اوپر پتیاں ڈالنے کا کیا سبب تھا۔ اس نے شیریں زبانی اور خوش کن لہجہ میں کہا کہ یہ عقل کی بات نہیں تھی کہ شربت کی اتنی مقدار جلدی سے پی جائے جب کہ وہ پسینہ میں شرابور تھا اور ہوا بھی گرم تھی۔ یک دم شربت پینا حکمت کے خلاف تھا۔ اسی وجہ سے اس نے احتیاطاً شربت میں پتیاں ڈال دی تھیں تاکہ وہ اسے آہستہ آہستہ پیے۔ بادشاہ اس کی اس حسن ادا سے بہت خوش ہوا۔ اس نے طے کیا کہ وہ اسے اپنے حرم میں داخل کرے گا۔ اس کے بعد اس نے باغبان سے دریافت کیا: ''تم اس باغ سے سالانہ کتنا منافع کماتے ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''تین سو دینار''۔ بادشاہ نے پوچھا تم دیوان کو کتنا ادا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا ''بادشاہ درختوں سے کچھ نہیں لیتا لیکن مزروعہ زمین سے پیداوار کا دسواں حصہ لیتا ہے۔'' بادشاہ کو خیال آیا کہ اس کی مملکت میں بہت سے باغات اور بے شمار درخت ہیں اگر اسے باغات کی

''توزک جہانگیری'' مغل حکمراں جہانگیر کی یادداشت ہے۔ یہ کتاب جہانگیر کی ذاتی زندگی سے تو روشناس کراتی ہی ہے اس کے عہد حکومت کے ہندوستان کی تاریخ تک رسائی کا بنیادی ماخذ بھی ہے۔ قومی اردو کونسل نے یہ اہم تاریخی کتاب دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ 776 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 395 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

پیداوار کا بھی دسواں حصہ ملنے لگے تو یہ ایک بڑی رقم ہوگی اور کاشتکار کا بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے بعد وہ حکم دے گا کہ باغات پر بھی ٹیکس لگائے جائیں۔ تب اس نے کہا ''میرے لیے کچھ اور انار کا شربت لاؤ۔'' لڑکی گئی اور کافی دیر کے بعد ذرا سی مقدار میں شربت لائی۔ بادشاہ نے کہا ''پہلی بار تم جلد آئی تھیں اور زیادہ (شربت) لائی تھیں۔ اس بار تم نے زیادہ دیر کی اور کم شربت لائیں۔'' لڑکی نے جواب دیا ''پہلی بار ایک انار سے میں نے پیالہ بھر لیا تھا اور لائی تھی۔ اس بار میں نے پانچ چھ اناروں سے شربت نکالا لیکن زیادہ نہ نکل سکا۔'' بادشاہ کی حیرت بڑھی۔ باغبان نے عرض کیا۔ ''پیداوار کا انحصار بادشاہ کی اچھی نیت پر منحصر ہے، مجھے خیال آیا کہ تم بادشاہ ہو، جب تم نے باغ سے آمدنی کا حال پوچھا تو تمھاری نیت میں یقیناً فرق آیا ہوگا۔ نتیجے میں پھلوں سے برکت اٹھ گئی۔'' بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اپنے دل سے یہ خیال نکال دیا، تب اس نے کہا ''مجھے پھر ایک پیالہ انار کا شربت لاؤ۔'' لڑکی دوبارہ اندر گئی اور جلدی سے ایک پیالہ انار کے شربت سے لبریز لائی اور اسے مسکراتے ہوئے خوشی کے ساتھ بادشاہ کو دیا۔ اس نے باغبان کی لڑکی کی ذہانت کی داد دی اور اصل واقعہ سے آگاہ کیا، لڑکی سے شادی کی درخواست کی اور اس سے شادی کر لی۔''

حقیقت آگاہ بادشاہ کی یہ سچی کہانی صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گی۔ جب تک انصاف پسند بادشاہ اپنی رعایا کی فلاح اور آسودگی کے لیے کام کریں گے تو بہتر فصل اور پیداوار کھیتوں و باغات سے دور نہیں ہوں گی۔ اللہ کی تعریف کی جانی چاہیے کہ اس زمانے میں اس ابدی حکومت میں پھلدار درختوں پر کوئی محصول نہیں عائد ہے۔ تمام مملکت میں ایک حبہ بھی حکومت کی طرف سے وصول کر کے خزانہ عامرہ میں نہیں داخل کیا جاتا۔ مزید برآں یہ حکم موجود ہے کہ اگر کوئی باغ کاشت کی زمین میں لگائے تو اس کی پیداوار (ٹیکس) سے مستثنیٰ ہے، مجھے امید ہے کہ اللہ جو بڑی شان والا ہے، ہمیشہ اس خادم پر اس کی اچھی نیت کی وجہ سے مہربان رہے گا۔

□□□

دیوان آبرو

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اولین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات آبرو کے چھ دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/25 روپے

دستنبو

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ و شنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی فوجی بغاوت کے دنوں میں دارالسلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات: 88، قیمت: -/12 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات: 317، قیمت: -/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام

ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری ''پرواز'' نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات و حقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی.ڈی. (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی.ڈی.): -/175 روپے

نوٹ: طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

مصنف: ایگن لارسن
مترجم: صالحہ بیگم

''تاریخ ایجادات'' سے ماخوذ

آواز کو محفوظ کرنے میں کامیابی

نیو جرسی میں 1876 میں سکونت اختیار کرنے کے بعد تھامس آلوا اڈیسن کا دھیان جن مسئلوں کی طرف رجوع ہوا ان میں ٹیلی گرافی سگنل کو محفوظ (ریکارڈ) کرنے کی ایک مشین بھی تھی۔ یہ موم کا ایک اسطوانہ تھا جس پر ایک سوئی مورس کوڈ کے ڈیش اور نقطوں کو بناتی تھی۔ ایک روز وہ اپنے معاون کے ساتھ گفتگو کرنے میں محو تھا کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ایک آواز کے ساتھ ہی سوئی میں ایک، جھٹکا ہوا اور سوئی اس کی انگلی میں چبھ گئی۔

ایک اوسط درجے کا سائنس داں اس واقعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا بلکہ اپنی انگلی سے خون صاف کرتے ہوئے اپنے تجربات کو جاری رکھتا۔ اڈیسن نے پہلے کہا تھا کہ دانشور 9-8 فیصد محنت اور کاوش سے اور صرف 2 فیصد تخلیقی تحریک سے وجود میں آتا ہے۔ عام سائنس دانوں سے مختلف اڈیسن نے یہ غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر سوئی کیوں اس کی انگلی میں چبھی۔ اگر انسانی آواز کی لہروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ سوئی کو جھٹکا دے سکتی ہیں تو یقیناً آواز کو کسی چیز کی سطح پر ریکارڈ کرنا ممکن ہے اور سوئی کو اس سطح پر بنائے ہوئے نشانات پر واپس لے جا کر اس آواز کو پھر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اڈیسن نے فوراً ذہن میں آئے خیالات کی بنا پر ایک خاکہ بنایا اور اپنے کاریگروں کے تعاون سے ایک مشین بنوائی۔ یہ ایک افقی تکلے پر مشتمل تھی جس پر تانبے کا ایک اسطوانہ لگا ہوا تھا اور جس کو چلانے کے لیے ایک ہینڈل لگا ہوا تھا۔ اور ساتھ ساتھ ایک قسم کا چونگا بھی تھا جو کہ جھلی سے مڑا ہوا تھا اور اس کے پتلے سرے پر سوئی لگی تھی۔ یہ سلنڈر کے اوپر ایک وسطی جگہ پر بٹھایا گیا تھا۔ اڈیسن کی یہ مشین صرف ایک ہی روز میں بن کر تیار ہو گئی۔ اڈیسن نے سلنڈر کے گرد مضبوطی سے ٹن کی چادر جڑی ہوئی تھی۔ اڈیسن نے ہینڈل کے ذریعہ مشین کو گھمانا شروع کیا اور چونگا میں بچوں کا گیت گایا۔ اس کے بعد اس نے سوئی کو پھر اسی جگہ پر رکھا جہاں سے اس نے شروع کیا تھا اور ہینڈل کو پھر چلایا اور اس کے گیت کی آواز مدھم سروں میں آنے لگی۔ اڈیسن نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ اس کامیابی پر حیرت زدہ رہ گیا۔

اڈیسن نے اپنی ایجاد کا نام فونوگراف رکھا۔ یہ ایجاد ایک سنسنی کا باعث ہوئی اور اس کی تجربہ گاہ میں مشین دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ عوام کو مینلو پارک تک لانے کے لیے خصوصی ریل گاڑیاں چلائی گئیں۔ اڈیسن کو واشنگٹن آنے کی دعوت دی گئی تاکہ وہ وہاں اپنے اعلیٰ افسران کے سامنے مشین کا مظاہرہ کر سکے اور سیاست دانوں کی آواز ریکارڈ کر سکے۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ آواز کو ریکارڈ کیا جا سکتا ہے اور وہ اس ایجاد کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ لیکن جنھوں نے اس مشین کو دیکھا اور اس کی آواز سنی انھوں نے اڈیسن کو ''مینلو پارک کا جادوگر'' کا خطاب دیا۔

اڈیسن پر یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی کہ اس نے ایک ناقص مشین کا عوام کے سامنے مظاہرہ کر کے غلطی کی ہے۔ اول تو ریکارڈ کی غرض سے استعمال ہونے والی ٹن کی چادر کو درست رکھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں تھا۔ دوئم یہ کہ ریکارڈ کی صلاحیت بہت کم تھی اور چند بار استعمال کے بعد آواز اس قدر مدھم پڑ جاتی کہ اس کا سننا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ چند ہی مہینوں کے اندر عوام کی دلچسپی ختم ہو گئی اور پھر اڈیسن نے اپنی توجہ دوسرے سائنسی مسئلوں کی طرف مبذول کر دی۔

دس سال بعد 1888 میں اس نے پھر فونوگراف کی طرف توجہ کی۔ مسلسل پانچ دن محنت کرنے کے بعد اس نے مشین کو ہر طرح مکمل کر دیا۔ ٹن

● ابتدائے آفرینش سے دورِ حاضر تک انسانی زندگی مسلسل تغیّر و تبدّل سے ہمکنار ہوتی رہی ہے۔ انسان اپنے ذہن و فکر سے کام لے کر ہمیشہ اپنے لیے آسانیاں فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ چنانچہ آگ اور کھیتی کی ایجاد نے جہاں کھانے میں آسانی اور خطرناک جانوروں سے تحفظ فراہم کیا وہیں پہیے نے رسل و رسائل میں آسانی بہم پہنچائی۔ ان ابتدائی ایجادوں سے تحریک پاکر انسان نے منصوبہ بند طریقے سے سوچنا شروع کیا اور نتیجے میں نئی نئی ایجادات سامنے آئیں۔ ''تاریخ ایجادات'' میں بھاپ کے انجن، بجلی، جوہری توانائی، پانی جہاز، ہوائی جہاز، تار پیغامات، ریڈیو، تصویر اور دیگر حیرت انگیز ایجادات کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ 399 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/152 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

کے خول کے بجائے اس نے موم کے سلنڈر کا استعمال کیا۔ اور ہینڈل کے بجائے گھڑی کی طرح آلے کا استعمال کیا۔ فونوگراف کی یہ نئی شکل ہوٹلوں اور پارکوں میں بہت مقبول ہوئی اور اڈیسن کو بے حد مالی فائدہ ہوا۔ دفتروں اور دوسرے مقامات میں جہاں بات کو فوراً ریکارڈ کرنا ہوتا ہے، فونوگراف بہت مقبول ہوا، تاوقت یہ کہ اس کی جگہ ٹیپ ریکارڈ نے لے لی۔

اسی دوران آواز کو ریکارڈ کرنے کے طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے کئی موجدوں نے تجربات جاری رکھے۔ ان میں الکزنڈر گراہم نے ایک انگریز چارلس ٹینٹر کی مدد سے ایک گراموفون مشین بنائی جس میں کارڈ بورڈ کا سلنڈر لگا تھا۔ لیکن موٹے طور پر اس نے اڈیسن کے ریکارڈ کرنے کے اصول ہی کو اپنایا۔

اس میدان میں فیصلہ کن ایجاد ایک جرمن ایمل برلینر نے 1887 میں کی۔ اس نے اڈیسن کے بنائے سلنڈر کی جگہ پر ایک موم سے بنی طشتری کا استعمال کیا۔ بعد میں اس نے ریکارڈ کاپی کرنے کے طریقوں کو رائج کیا۔ اس کاپی کرنے کا طریقہ فوٹو کاپی کرنے کے طریقوں کی طرح ہے۔ پہلے آواز کو موم کی طشتری پر ریکارڈ کیا جاتا ہے اور پھر اس سے دھات کی میٹرکس بنائی جاتی ہے جس سے حسب ضرورت ریکارڈ کی کاپی بنائی جاسکتی ہے۔ یہ طریقہ اب تک ریکارڈ بنانے میں رائج ہے۔ لیکن برلینر کے بعد اس میدان میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ ان میں برقی طاقت سے ریکارڈنگ کرنے کا طریقہ بہت اہم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد دیر تک چلنے والا یا لانگ پلیئنگ ریکارڈ کا ظہور ہوا۔ اس کا موجد کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم کا ڈاکٹر پیٹر گولڈ مارک تھا۔ یہ ہر ایک منٹ میں 33⅓ یا 45 بار گردش کرتا ہے جب کہ برلینر کا ریکارڈ ہر منٹ میں 78 بار گردش کرتا تھا۔ اس سے موسیقی وغیرہ جیسے لمبے پروگرام کو ایک ہی طشتری میں ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی آواز کے ہر نشیب و فراز کو ریکارڈ کرنے کا طریقہ مکمل کیا گیا اور اسٹیریو سسٹم کو رائج کیا گیا۔ اسٹیریو سسٹم میں دو مائیکروفون اور دو لاؤڈ اسپیکر ہوتے ہیں جو دو کانوں کی جگہ پر ہوتے ہیں چونکہ ایک ہی آواز کو دونوں کانوں تک رسائی حاصل کرنے میں کچھ وقفہ درکار ہوتا ہے اس لیے اسٹیریو سسٹم کے ذریعے حقیقی آواز اپنی ساری لہروں اور نشیب و فراز کے ساتھ ہم تک پہنچ سکتی ہے۔

بنیادی طور پر گراموفون کے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہ برلینر کا ہی خیال تھا کہ اڈیسن کے موم کے سلنڈر کو موم کی طشتری (Disc) میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ اس سے جتنی کاپی کی ضرورت ہو بنائی جاسکیں۔ اس طرح گراموفون ایک کارآمد ایجاد بنا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اس صدی کی عظیم ہستیوں کی آواز اور مشہور فن کاروں کے گانے اور موسیقی حقیقی صورت میں ریکارڈ کے ذریعے ہمیں دستیاب ہیں۔

1899 میں کوپن ہیگن کے رہنے والے والڈیمر پولسن نے جو لاسلکی ٹیلی گرافی کے ابتدائی موجدوں میں تھا، ایک نئی ایجاد کی اور اس کا نام "ٹیلی گرافون" رکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بکس تھا جس میں دو ڈرم تھے جن پر لوہے کا ٹیپ یا تار گردش کیا ہوا تھا۔ مشین چلنے پر یہ تار ایک ڈرم سے کھلتا اور دوسرے پر چڑھ جاتا، اس عمل کے دوران تار مقناطیس کے قطبین کے قریب سے گزرتا تھا۔ صوتی لہریں جب مائیکروفون میں برقی نوعیت اختیار کر لیں تو یہ برقی مقناطیس پر اثر انداز ہوتیں جو کہ فوراً دی تار کو مقناطیسی صلاحیت عطا کر دیتا۔ ریکارڈ کو دوبارہ صوتی شکل دینے کے لیے تار کو برقی مقناطیس سے گزارا جاتا جو کہ پردہ کی حرکت سے آواز کو جنم دے دیتا۔

پولسن کے مطابق یہ فونوگرافک مشین تھی جس کے ذریعے سننے والے کی غیر حاضری میں بھی پیغام کو ریکارڈ کیا جاسکتا تھا۔ پولسن کے مطابق یہ بھی ممکن تھا کہ اگر سننے والا موجود نہ ہو تو ٹیلی فون کرنے والے کو یہ پیغام دیا جاسکتا ہے کہ "تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کیجیے۔" اس فونوگراف میں یہ خوبی تھی کہ برقی لہروں کے ذریعہ ریکارڈ کو تار سے ہٹایا جاسکتا تھا اور اس طرح ایک ہی تار کو بار بار استعمال کرنا ممکن تھا۔

یہ ایجاد چوں کہ وقت سے پہلے ظہور میں آگئی تھی اس لیے لوگ اسے تقریباً بیس سال تک بھولے رہے۔ 1918 میں امریکہ کے سائنس دانوں نے اس کی طرف دوبارہ توجہ کی اور ایک جرمنی کے انجینئر کرٹ اسٹیل نے بالآخر یہ کارآمد تار پر ریکارڈ کرنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالا جو نشریات کے لیے کارآمد ہے۔ دوسرے جرمن موجد فیومر نے 1929 میں مقناطیسی ٹیپ پر تجربہ کیا جس میں فولاد کے ریزوں کو نامیاتی گوند کے ذریعہ چسپاں کر دیا گیا تھا۔ اس دریافت کے بعد بھی چھ سال اور گزر گئے تب کہیں جاکر میگنیٹوفون مکمل ہوا۔ اس میں پلاسٹک کے ٹیپ کو استعمال کیا گیا جس پر فیرس آکسائڈ کی تہ جمائی ہوئی تھی۔ ٹیپ ریکارڈنگ میں آج تک اسی ٹیپ کا استعمال ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے قبل بھی جرمنی کے بیشتر براڈ کاسٹنگ کے پروگرام کو اسی ٹیپ کے ذریعے یکجا کیا جاتا تھا۔ یہ ریکارڈنگ اتنی اچھی ہوتی تھی کہ سننے والے کو بسا اوقات اس پر قدرتی آواز کا گمان ہوتا تھا۔ یہ ٹیپ مشین چوں کہ

بڑی اور وزنی ہوا کرتی تھیں اس لیے جنگ کے دوران جرمنی کی فوجی ضرورتوں کے لیے ہلکی اور چھوٹی مشین بنائی گئی۔ اسی دوران امریکہ میں بھی فوجی ضرورتوں کے لیے اس مشین کے نئے ماڈل بنائے گئے جسے ہوائی جہازوں پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس ایجاد کا بانی ایک نوجوان انجینئر ماروِن کامراس تھا۔ یہ ماڈل 1940 میں شکاگو کی ایک تجربہ گاہ میں بنایا گیا۔

چھوٹے، ہلکے پھلکے، کارآمد ٹیپ ریکارڈ کا برطانیہ، امریکہ اور جرمنی میں استعمال جنگ کے بعد شروع ہوا۔ یہ گھروں اور دفتروں میں یکساں طور پر کارآمد تھے۔ مشین کے بڑے ماڈل جن میں ٹیپ کی رفتار تیس انچ فی سکنڈ ہوتی ہے صرف براڈ کاسٹنگ اسٹیشن، فلم، ٹیلی ویژن اور گراموفون اسٹوڈیو میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ ٹیپ ریکارڈنگ سے گراموفون ریکارڈنگ (طشتری)، فلم، یا دوسرے ٹیپ پر ریکارڈ کیا جائے تو اس کی صفت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دوئم یہ کہ ٹیپ کو بھی فلم کی طرح کاٹا جا سکتا ہے، جوڑا جا سکتا ہے اور ایڈیٹ کیا جا سکتا ہے۔ موم کی طشتری پر ریکارڈنگ کرتے وقت اگر کچھ خامی پیدا ہو جاتی ہے تو پوری ریکارڈنگ پھر سے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ٹیپ ریکارڈنگ میں اسی جگہ کو کاٹا جاتا ہے جہاں گڑبڑی ہوتی ہے۔

طرح طرح کے انواع واقسام کے ٹیپ ریکارڈر آج کل مختلف شعبوں میں اور جگہوں پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں ریکارڈنگ اسٹوڈیو کے بڑے بڑے ٹیپ ریکارڈر سے لے کر جیب کے اندر سما جانے والے ٹیپ ریکارڈر بھی شامل ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ جہاں عوام کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں وہیں اخبار نویسوں کے لیے بھی کارآمد ہیں اور گانے والوں اور موسیقار کو اپنے گانے کے لیے اور موسیقی کو سننا ممکن ہو گیا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ ٹیپ ریکارڈ غیر زبانوں کو سیکھنے، مقرر کی غیر حاضری میں تقریر نشر کرنے، شہری معاملات میں پیغام نشر کرنے، لمبی میٹنگ کا ریکارڈ قائم کرنے اور زمین سے ہوائی جہاز تک بات چیت کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔

□□□

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریک خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریک آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب وخیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات وکائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابر نامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

''تزکِ بابری'' کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم ورواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب وہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110 066

زبیر احمد بھاگلپوری

مینجمنٹ کے طلبہ کی بڑھتی اہمیت

ایک وقت تھا کہ ہمارا ملک "Brain drain" (ہجرت کی وجہ سے ہنر مند لوگوں کی قلت) کے مسئلے سے دوچار تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد روزگار کی تلاش میں بیرون ملک کا رخ اختیار کر لیتے تھے۔ آج کثیر ملکی کمپنیوں کے آ جانے سے نہ صرف کیمپس انٹرویو میں اضافہ ہوا ہے بلکہ باصلاحیت امیدواروں کو زیادہ سے زیادہ تنخواہ دینے کے معاملے میں بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش جاری ہے۔ خاص طور سے بزنس مینجمنٹ کے طلبہ کو آج جو تنخواہیں مل رہی ہیں، اس کا کچھ برسوں قبل تک لوگوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ بڑی رقم صرف غیر ملکی کمپنیاں ہی دے رہی ہیں، لیکن ان کے لیے ہندوستانی بازار کے دروازے کھل جانے سے تنخواہوں کی ادائیگی کے معاملے میں ایک طرح کا مسابقتی ماحول بن گیا ہے جس کے سبب ملکی کمپنیاں بھی مینجمنٹ کے باصلاحیت اور ہونہار طلبہ کو منہ مانگی تنخواہ پر ملازمت دے رہی ہیں۔

مینجمنٹ کے حوالے سے کولکاتا، بنگلور اور احمد آباد میں قائم آئی.آئی.ایم. ملک کے اعلیٰ ترین ادارے تصور کیے جاتے ہیں۔ ویسے تو آئی.آئی.ایم. کے طلبہ ہی اچھی تنخواہ کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن انفارمیشن ٹکنالوجی کے شعبے میں بنگلور کے بعد اپنا مقام بنا چکے حیدرآباد واقع انڈین اسکول آف بزنس (آئی.ایس.بی.) نے اس بار آئی.آئی.ایم. کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں کے ایک طالب علم کو ملک کے مینجمنٹ اداروں کی تاریخ میں اب تک کی سب سے بڑی تنخواہ کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس معاملے میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کے ابھی تک غلبے کو توڑتے ہوئے ہندوستان کی ہی ایک انفارمیشن ٹیکنالوجی کی کمپنی نے اس طالب علم کو سالانہ 1.04 کروڑ یعنی 233800 امریکی ڈالر کی پیش کش کی۔ یہ ہندوستانی طلبہ کو ملنے والی ابھی تک کی سب سے بڑی تنخواہ ہے جو سال گذشتہ کے مقابلے 29 فیصد زیادہ ہے۔ یہاں کے چار طلبہ کو 200000 (دو لاکھ) امریکی ڈالر سے زیادہ کی پیش کش ہوئی ہے۔ آئی.ایس.بی. کی سب سے زیادہ گھریلو تنخواہ اس سال 30.34 لاکھ ہے جو سال گذشتہ سے 44 فیصد زیادہ ہے۔

آئی.آئی.ایم. کے لیے 2006 کے سال کو کئی نقطۂ نظر سے انقلاب آفریں کہا جاسکتا ہے۔ اس سال کئی دلچسپ حقائق ابھر کر سامنے آئے۔ رواں سال میں کامیاب طلبہ کا بیرون ملک رخ کرنے کے رجحان میں آئی کمی ہے۔ اب اپنے ملک میں رہنے کو ہی وہ ترجیح دینے لگے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے، اپنے ملک میں ہی انہیں اونچی تنخواہ ملنے لگی۔ واضح ہو کہ آئی.آئی.ایم. احمد آباد کی شناخت دیگر اداروں کے مقابلے سب سے اہم رہی ہے۔ یہاں کے 510 طلبہ میں سے 235 نے پلیسمنٹ میں حصہ لیا، جن میں سے صرف 72 طلبہ نے ہی بیرون ملک کی پیش کش قبول کی۔ یہاں کے ایک طالب علم کو ورکلے کمپنی نے ایسوسی ایٹ گریڈ کا عہدہ پیش کرتے ہوئے 185000 (ایک لاکھ پچاسی ہزار) ڈالر تنخواہ پر ملازمت دی ہے۔ یہاں ورکلے نے 16، معروف سرمایہ کار کمپنی لیہمن برادرس نے 12، میرل لنچ نے 8، اے.بی.ای.ایمرد نے 7 طلبہ کو اعلیٰ ملازمت کی پیش کش کی ہے۔ اس کے علاوہ سٹی گروپ؛ سی.ایس.ایف.؛ ایچ.ایس.بی.سی. اور جے.پی. مورگن جیسی کمپنیوں نے بھی طلبہ کو اپنے یہاں ملازمت دی۔

ہندوستان میں ہی ملازمت کرنے والے آئی.آئی.ایم. احمد آباد کے 33 فیصد سے زیادہ طلبہ کو دس لاکھ سالانہ سے زیادہ کے پیکج کی پیش کش کی گئی ہے۔ آئی.آئی.ایم. کولکاتا آنے والی کمپنیوں کی تعداد اس سال 114 رہی۔ انوسٹمنٹ بینکنگ، کنسلٹینگ اور مارکیٹنگ وغیرہ کے شعبے سے تعلق رکھنے والی کمپنیاں یہاں زیادہ آتی ہیں۔ یہاں کے ایک طالب علم کو 2001 میں 225000 (دو لاکھ پچیس ہزار) ڈالر کی پیش کش کی گئی تھی جو ابھی تک کا ریکارڈ ہے۔ گھریلو پیکج کے شعبے میں آئی.آئی.ایم. کولکاتا آج بھی اعلیٰ ترین مقام کا حقدار ہے۔ اس سال یہاں کی گھریلو اوسط تنخواہ 9.81 لاکھ روپئے رہی۔ یہاں کی سب سے زیادہ بین الاقوامی تنخواہ اس سال 152000 (ایک لاکھ باون ہزار) ڈالر رہی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ملکی کمپنیاں بھی اور اچھی تنخواہ بڑی تعداد میں ان طلبہ کو دے رہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ پیش کش کرنے والی غیر ملکی کمپنیوں کی تعداد کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کثیر ملکی کمپنیوں کے آ جانے سے ان کی تعداد ملکی کمپنیوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ سال گذشتہ کے مقابلے آئی.آئی.ایم. بنگلور آنے والی غیر ملکی کمپنیوں کی تعداد 83 سے بڑھ کر 100 ہو گئی۔ اس طرح گھریلو اور بین الاقوامی دونوں تنخواہوں میں اضافہ ہوا ہے۔

اس سال سب سے زیادہ ہندوستانی پیکج 34 لاکھ سالانہ رہا۔ یہاں کے ایک طالب علم 193000 (ایک لاکھ ترانوے ہزار) ڈالر کی غیر ملکی ملازمت کی پیش کش کی گئی ابھی تک کبھی آئی آئی ایم. میں سب سے زیادہ ہے۔ ان دنوں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کے بیشتر طلبہ کا رجحان کنسلٹنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں کے 26 فیصد طلبہ نے اس طرح کی پیش کش کی۔

مسرت کی بات یہ ہے کہ اس سال کنسلٹنگ، انفارمیشن ٹکنالوجی، ایف.ایم.جی.سی.؛ بینکنگ اور فنانشل سروسز جیسے روایتی شعبے کے علاوہ میڈیا کنسلٹنگ؛ ریئل اسٹیٹ کنسلٹنگ، صحت خدمات؛ بی.پی.او؛ کے.پی.او؛ ٹریول اینڈ ٹورازم؛ سپلائی چین کنسلٹنگ اور دیہی تعلیم جیسے شعبے بھی ان طلبہ کے لیے نئے کیریئر متبادل کے طور پر ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کئی طلبہ نے اے.بی.پی؛ جی.بی.این. اور آر.پی.جی. سا ریگاما جیسی میڈیا کمپنیوں کی پیش کش قبول کیں۔ کنسلٹنگ کی بجائے ایک ایف.ایم. ریڈیو چینل قائم کرنے میں مدد کرنے کی پیش کش قبول کرنے والے آئی.ایس.بی. کے ایک طالب علم کارتک رام کرشنن نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ کنسلٹنگ میں زیادہ پیسہ ہونے کے باوجود میڈیا کا چیلنج اسے زیادہ اچھا لگا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ مرچنٹ نیوی، تربیت یافتہ ڈاکٹر بھی اب آئی آئی ایم. اور آئی.ایس.بی. جیسے اداروں میں آ کر اپنا کیریئر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک غیر ملکی ریئل اسٹیٹ کمپنی میں ملازمت کرنے والی آئی.ایس.بی. کی طالبہ سواتی سنگھ نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ وہ پہلے مرچنٹ نیوی میں تھیں لیکن اب وہ مالیاتی شعبے میں دلچسپی رکھتی ہیں جو انھیں مینجمنٹ اداروں کی ڈگری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

کبھی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اور دیگر معتبر اداروں کے طلبہ کو مینجمنٹ کے جونیئر لیول پر بحال کیا جاتا تھا لیکن اس سوچ اور طرز عمل میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ اب ان طلبہ کو چیف ایگزیکٹیو انٹرنیشنل مارکیٹنگ کے وائس پریزیڈنٹ، مارکیٹنگ چیف، انٹرنیشنل کنٹری مینیجر اور ایسے ہی اعلیٰ عہدوں کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے۔ چند برس پہلے تک کرکٹ کی طرح بڑے مینجمنٹ اداروں میں بھی عروس البلاد (ممبئی) کے طلبہ کی تعداد ہی زیادہ ہوتی تھی لیکن اب چھوٹے چھوٹے شہروں کے طلبہ بھی بڑی تعداد میں داخلہ پا رہے ہیں اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو رہے ہیں۔

Urdu Section
Bihar Legislative Council
Patna-15

□□□

دھوپ چولھا

مصنف: ایم.ایم. ہدیٰ/مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
"کیمیا کی کہانی" میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد و توہمات سے واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔
اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت -/18 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبر نامہ

''نئی اردو غزل میں زیب غوری کا مرتبہ'' پر سیمینار

● کانپور، 27 اگست۔ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ''نئی اردو غزل میں زیب غوری کا مرتبہ'' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''زیب غوری جیسے شاعر بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ان شاعروں میں سے تھے جو شاعری کو ہی وظیفۂ حیات سمجھتے ہیں اور یہ سلسلہ میر تقی میر سے جا کر مل جاتا ہے کیونکہ زیب کی شاعری میں میر کی سی روانی ہے۔'' اس سیمینار کا انعقاد ادبی تنظیم خسرو کبیر فاؤنڈیشن کی طرف سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے اردو کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کبیر، تلسی اور جائسی سب ہمارے شاعر ہیں اور ہماری روایت سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ انھیں فراموش کرنا اردو والوں کی غلطی ہے۔ ان سے ہماری روایت کو استحکام ملتا ہے۔ صدر جلسہ قاضی نور السلام نے کہا کہ زیب غوری جیسے شاعر گزرتے زمانے کے ساتھ جاوداں ہوتے جاتے ہیں۔ زیب غوری جیسا بالغ نظر اور تفکیری ذہن رکھنے والا شاعر مختصر زندگی پانے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ نئی اردو غزل کی مختصر ترین فہرست بھی زیب کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے مضمون بعنوان ''زیب غوری کی غزل — جتنا کھلا نیرنگ معانی اور نہاں سا دکھائی دیا'' میں کہا کہ زیب غوری کی شعری کائنات میں داخل ہونا کسی بھری پری آرٹ گیلری سے روشناس ہونا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ''زرد زرخیز'' کا آغاز جن شعروں سے ہوتا ہے ان میں زیب کے تخلیقی مزاج کا غالب عنصر ان کی بصارت یا ان کے بصری ادراک کا تابع دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ''زیب غوری کے انفراد کا ایک پہلو'' کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ زیب غوری کی غزل کا سب سے پہلا اور بنیادی تقاضا یہی ہے کہ ہم اسے اپنے موجودہ آلات نقد سے نہ جانچیں۔ ان کی شاعری اپنے تحت النفس میں اپنی فضا، اپنی لفظیات، اپنے عملی حواس فطرت کے مختلف النوع مظاہر اور اجزا سے اپنی معاملت اور عورت کو اس کے پورے وجود بلکہ پورے جسمانی وجود کے ساتھ محسوس کرنے اور اپنے جسم کی سلوٹوں میں رچانے بسانے کے عمل کے اعتبار سے جا بجا ایک نئے تجربہ کا حکم رکھتی ہے۔

پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''جتنا کھلا نیرنگ معانی اور نہاں سا دکھائی دیا'' کے زیر عنوان اپنے مقالے میں کہا کہ زیب غوری کا امتیاز اظہار کا وہ اسلوب ہے جو انھوں نے لفظوں کی نئی ترتیب اور انوکھے سیاق سے اپنے لیے ایجاد کیا ہے۔ عشرت ظفر نے زیب غوری کی غزل کا ''فارسی روایت سے رشتہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ خسرو کبیر فاؤنڈیشن کے صدر راشد نادری سیمینار کے کنوینر تھے۔ جلسے کی نظامت خسرو کبیر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری اور حلیم مسلم پوسٹ گریجویٹ کالج کے استاد خان احمد فاروق نے کی۔ آخر میں روزنامہ ''انوار قوم'' کے مدیر اعلیٰ زبیر احمد فاروقی نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

''قدیم دلی کالج کی علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات'' پر سیمینار

● نئی دہلی، یکم ستمبر۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے سیمینار بعنوان ''قدیم دلی کالج کی علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات'' کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کیا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن مہمان ذی وقار تھے۔ اجلاس کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی نے جبکہ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔ پروفیسر مشیر الحسن نے اپنی تقریر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ تاریخ میں اہم رول ادا کرنے والے تعلیمی اداروں پر باقاعدہ تحقیق نہیں کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ ہو یا جامعہ یا پھر دار العلوم دیوبند اور دوسرے ادارے، ان میں سے کسی کی بھی مکمل تاریخ آج تک انگریزی میں موجود نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ دلی کالج کی تاریخ کے بارے میں سب سے بہترین کتاب سی ایف اینڈریو کی ہے جس میں اس زمانے کی تہذیب، ثقافت، ادب اور کالج کے کام کاج کے بارے میں کافی کچھ تفصیلات ہیں۔

جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد نے اپنی تقریر میں کہا کہ دلی کالج کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ایسا کالج ہو جس نے ایسے پر آشوب دور میں اور پابندیوں کے باوجود علم و زبان کی ایسی خدمت کی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں جدید تعلیم کا چراغ سب سے پہلے دلی کالج نے ہی روشن کیا تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ دلی کالج محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک روایت اور اردو زبان، ادب، علم اور ثقافت کی ٹکسال ہے جس نے ہمیشہ ہی کھرے سکے ڈھالے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں یہ غلام نصیر الدین کے دادا مولانا فخر کا مدرسہ تھا۔ غازی الدین نے تو صرف اس کی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس سے قبل خیر مقدمی کلمات میں دلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ دلی کالج نے اردو زبان، شاعری، نثر، تنقید وغیرہ کے میدان

میں ایک کے بعد ایک مایہ ناز ہستیاں پیدا کیں۔ آخر میں مشہور شاعر اور اردو اکادمی کے رکن متین امروہوی نے دلی کالج کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن پروفیسر تنویر احمد علوی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قدیم دلی کالج نے ایسے عالم پیدا کیے جنھوں نے علمی اور تحقیقی روایت کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دلی کالج کے اساتذہ تو اہم ہیں ہی لیکن اس کالج کے طلبہ ان سے بھی زیادہ اہم ہیں جن کی فکر ونظر کے اجالے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن خواجہ حسن ثانی نظامی نے دلی کالج کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ مجلس صدارت کے تیسرے رکن قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کا جائزہ لیا۔ نظامت ڈاکٹر عفت زریں نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر امیر حسن عابدی (دلی کالج کی یادیں)، گربچن چندن (قدیم دلی کالج: مشرقی اور مغربی علم کا سنگم)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (قدیم دلی کالج اور غیر ملکی پرنسپل)، ڈاکٹر محمود فیاض (مدرسہ غازی الدین اور قدیم دلی کالج: ارتقائی سفر) اور علی ظہیر نقوی (اردو کی علمی نثر کے فروغ میں دلی کالج کا حصہ) نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر صغریٰ مہدی اور رضا لائبریری رام پور کے او ایس ڈی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی شامل تھے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر خالد اشرف نے کی۔ اس اجلاس میں ریاض عمر (دلی کالج کی انتظامیہ کے ممبران کی خدمات)، ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی (ماسٹر رام چندر اور ان کے رسالے) ڈاکٹر مظہر احمد (قدیم دلی کالج اور 1857 کا غدر) اور فیروز بخت احمد (دلی کالج کی سیاسی سرگرمیاں) نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اجلاس کے اختتام پر سکریٹری اردو اکادمی سید مرغوب حیدر عابدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

قومی اردو میڈیا کانفرنس

● نئی دہلی، 13 اگست۔ ''یو این آئی اردو سروس کو وزارت ترقی انسانی وسائل امداد کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے 25 لاکھ روپئے دے گی۔ 15 اگست سے دور درشن کا اردو چینل شروع کرنے کا فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔ یہ چینل ملک کی سوچ میں بہت بڑی تبدیلی لا سکتا ہے کیونکہ دور درشن آج بھی ملک میں سب سے زیادہ دیکھا جاتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر ترقی انسانی وسائل ارجن سنگھ نے انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقد ''نیشنل اردو میڈیا کانفرنس'' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اس کانفرنس کا انعقاد معروف سماجی کارکن نوید حامد نے کیا تھا جس میں ملک بھر سے اردو اخبارات کے مالک و مدیران اور سینئر صحافیوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں اردو اخبارات و جرائد کو درپیش مسائل کو مختلف زاویوں سے اٹھایا گیا۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات پریہ رنجن داس منشی نے کی جب کہ مہمانان خصوصی کے طور پر مرکزی وزیر برائے پنچایتی راج منی شنکر ایر نے شرکت کی۔ مہمانان ذی وقار محترمہ نرملا دیش پانڈے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی تھے۔

افتتاحی تقریر میں مرکزی وزیر انسانی وسائل ارجن سنگھ نے کہا کہ دور درشن کے اردو چینل سے اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور فاصلوں کو کم کرنے میں بھی کامیابی ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم لوگوں کے نظریات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے تو اس سے اتفاق و اتحاد کو نقصان پہنچے گا۔ منی شنکر ایر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں نے بہت ترقی کی ہے لیکن شمالی ہند خاص طور سے اتر پردیش کا مسلمان ہر اعتبار سے کافی پسماندہ رہ گیا کیونکہ تقسیم کا زیادہ اثر یہیں کے مسلمانوں پر پڑا۔ انھوں نے کہا کہ ہم پنچایت راج سے سب کے لیے تعلیم مہم کو جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ امیر، غریب اور شہر، گاؤں کے درمیان کے فاصلے کو کم کیا جا سکے۔

پریہ رنجن داس منشی نے میڈیا کے سنجیدہ اور تعمیری رول کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ملک میں لینگویج میڈیا کی اہمیت و افادیت کافی زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی روٹی کی طرح ہے جو بھوک مٹاتی ہے لیکن اردو پانی کی طرح ہے جو پیاس بجھانے کا کام کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایشیائی کلچر میں اردو رابطے کی اہم زبان ہے۔ اردو کسی مذہب کی نہیں تہذیب کی زبان ہے۔ پریہ رنجن داس منشی نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ وہ اردو اخبارات کے تمام جائز مسائل کو حل کرانے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ایڈیٹر عزیز برنی نے اس موقع پر کہا کہ جس زبان نے ملک کو آزادی دلانے میں اہم کردار ادا کیا آج وہی غلامی کی زندگی جینے کے لیے مجبور ہے۔ اردو اخبارات کو عام طور پر پیش آنے والے مسائل پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی۔

اس سے قبل اپنی تقریر میں روزنامہ ''انقلاب'' کے مدیر شاہد لطیف نے کہا کہ اردو زبان کو آج تک اس کا جائز حق نہیں ملا اور اسے مسلمانوں کی زبان بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات کو امداد کی نہیں اشتراک کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات کے قاری زیادہ ہیں جب کہ خریدار کم ہیں۔ نیوز پرنٹ مہنگا ہے اور اشتہارات نہ کے برابر ہیں۔ روزنامہ ''پرتاپ'' کے ایڈیٹر کے نریندر نے کہا کہ 60 سال میں اردو کی اتنی بدحالی کیوں ہوئی اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے شکوہ کیا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا ہے۔ اردو صحافیوں کو کسی غیر ملکی وفد میں شامل نہیں کیا جاتا۔ روزنامہ ''ہندوستان جدید'' ممبئی کے ایڈیٹر سرفراز آرزو نے مطالبہ کیا کہ اردو اخبارات کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو نوڈل ایجنسی بنایا جائے اور اردو اخبارات کو اشتہارات کے لیے بجٹ میں 10 فی صد رقم مختص کی جائے۔ ان کے علاوہ ''اخبار مشرق'' کے ایڈیٹر وسیم الحق،

"خدمت" کے ایڈیٹر غلام رسول کار، یو این آئی کے ڈائرکٹر سوئی ابراہم اور کریم آر منگیری وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں سید شاہد مہدی، سلمان ماہنی، معصوم مرادآبادی، زبیر فاروقی، ذہانت علی بیگ، ظفر آغا، ظفر الاسلام، مودود صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کانفرنس میں شرکت کرنے والے معروف افراد میں ممبر پارلیمنٹ مولانا محمود مدنی، نور جہاں ثروت، شیخ منظور احمد، ایس ایم آصف، جاوید حبیب، عتیق صدیقی، سہیل انجم، علی جاوید، معصوم مرادآبادی، انیس درانی، ذہانت بیگ، امان عباس، نفیس احمد، شاہد پرویز وغیرہ شامل تھے۔ **("راشٹریہ سہارا" دہلی)**

اردو چینل کا آغاز

● نئی دہلی، 15 اگست۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ کے ہاتھوں دور درشن کے اولین اردو سٹیلائٹ چینل کے افتتاح کے ساتھ ہی ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جانے والی اس گنگا جمنی زبان کی براڈ کاسٹنگ کے ایک نئے عہد کا آغاز ہو گیا۔ ڈی ڈی اردو کے نام سے دور درشن کا یہ 19 واں سٹیلائٹ چینل ہے جسے کشمیر سے اتر پردیش، بنگال سے دہلی اور ممبئی، حیدرآباد، بنگلور کے علاوہ ان تمام شہروں اور دیہاتوں کو نظر میں رکھ کر شروع کیا گیا ہے جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

("راشٹریہ سہارا" دہلی)

ساہتیہ اکادمی کے بھاشا سمان اور ترجمہ ایوارڈ کا جلسہ

● بھوپال۔ ساہتیہ اکادمی کے بھاشا سمان اور ترجمہ ایوارڈ کے سالانہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی نے کہا کہ بغیر تخلیقی حسیت کے ترجمہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ جس مترجم میں جتنا زیادہ تخلیقی جوہر ہوگا اس کا ترجمہ اتنا ہی اعلیٰ معیار کا ہوگا۔ اس موقعے پر ملیالم کے سرکردہ فکشن نگار ایم ٹی واسو دیون نائر نے ایوارڈ یافتگان کا استقبال کیا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بطور صدر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا۔ رمیش چندر شاہ جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے جب کہ مہمانوں کا خیر مقدم ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اگر بار کرشنا مورتی نے کیا۔ بھاشا سمان سے نوازے جانے والے ادیب ہیں: ایل بسورا جو، نرائن بھمن داس ساماتانی، ذی گوکلے اور بدرسین گرو۔

انعام برائے ترجمہ حاصل کرنے والے ادیبوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

پرفل سنگی (آسامی)، رنجن بندو پادھیائے (بنگالی) پر میلانار جاری (بوڈو) پرتیک کانجی لال (انگریزی) اوما راندیریا (گجراتی) نرملا جین (ہندی) پنچا کشری ہیرے متھ (کنڑ) شفیع شوق (کشمیری) رمیش لاڈ (کونکنی) یوگا نند جھا (میتھلی) ٹی بی وینو گوپال پنکر (ملیالم) آنجہانی ایریم بابو سنگھ (منی پوری) اشوک جین (مراٹھی) پشپ دھر شرما (نیپالی) پر بھاکر سوین (اڑیا) پیارا سنگھ (پنجابی) اوپندرا نو (راجستھانی) جناردھن ہیگڑے (سنسکرت) ہندراج بلوانی (سندھی) پی کرشنا سوامی (تامل) جی ایس موہن (تیلگو) خالد محمود (اردو)۔

("قومی آواز" دہلی)

نیپال اردو نیوز کلب کا قیام

● کرشنا نگر، 11 جولائی۔ نیپال میں اردو کے فروغ کے لیے مسلم کمیونٹی ہال کرشنا نگر (نیپال) میں مقامی صحافیوں، دانشوروں اور سماجی کارکنوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں پروگرام کنوینر اور معروف تجزیہ نگار عبدالصبور ندوی نے "نیپال میں اردو، تعارف و امکانات" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج نیپال میں اردو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے اور بیشتر مقامات پر بولی بھی جاتی ہے، اردو لکھنا اور پڑھنا بھی عام ہو رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں بولی جانے والی 101 زبانوں میں اردو کو گیارھواں مقام حاصل ہے، مگر حکومت کی بے توجہی مسلسل جاری ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس ملک میں اردو کی بقا کے لیے کوشش کریں۔ صدر جلسہ نیپال کے معروف شاعر اور صحافی زاہد آزاد جھنڈا نگری نے کہا کہ ہمیں نیپال میں اردو کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم تیار کرنا ہوگا۔ جلسے میں صحافی صغیر احمد خاکسار، صحافی سلمان ہندی، نیپالی اخبار کے صحافی نصیب حسین، سماجی کارکن عبدالنور سراجی، مولانا عبدالقیوم مدنی، عمران بشیر، عبدالعظیم سلفی، انجینئر حسان نور، کفایت اللہ، سفر علی، سراج احمد فاروقی، احسان احمد خاں، الحاج رحم اللہ اور احمد آزاد نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر "نیپال اردو نیوز کلب" کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جس میں زاہد آزاد جھنڈا نگری۔ صدر، صغیر احمد خاکسار۔ نائب صدر، عبدالصبور ندوی۔ سکریٹری، مولانا عبدالقیوم مدنی۔ نائب سکریٹری اور سفر علی۔ خزانچی کے طور پر بالاتفاق منتخب ہوئے۔

(ڈاک سے)

ادیب ماہر کو بطور اردو مترجم رکھے جانے کی ہائی کورٹ کی ہدایت

● الہ آباد، 2 اگست۔ ادبی تنظیم اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے عدالت عالیہ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے جس میں عزت مآب جسٹس ایس۔ کے۔ سنگھ نے ضلع مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ آفیسر مہاراج گنج کے خط مورخہ 12-06-1995 کو کالعدم قرار دیتے ہوئے ہدایت دی ہے کہ مدعی ضیاء الدین کو اردو مترجم کم جونیئر کلرک کی اسامی پر دوبارہ جوائن کرائے جس طرح کہ عدالت سدھارتھ نگر کے عبدالرحمن کے مقدمہ نمبر 30567\1995 میں مورخہ 20-03-1998 کو ہدایت دے چکی ہے۔

تنظیم کے بانی دکنو ینر بحر العلوم اور قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ عزت مآب عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے مورخہ 20-03-1998 کو کہا تھا کہ قانونی طور پر تقرر کیے گئے امیدوار یعنی اردو مترجم کم جونیئر کلرک کو نوکری سے باہر نہیں نکالا جا سکتا، کیونکہ حکومت نے اپنے لازمی اصول وضوابط میں بعد میں تبدیلی کر لی ہے۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

دونوں عہدیداروں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ حکومت نے اردو مترجمین کی تقرری کے لیے جو اشتہار نکالا تھا اس میں ''ادیب ماہر'' کو ''انٹرمیڈیٹ'' کے مساوی مانا تھا۔ چنانچہ صرف ادیب ماہر پاس عبد الرحمٰن و ضیاء الدین جیسے ہزاروں امیدواروں نے اردو مترجمین کی نوکری کا مقابلہ جاتی امتحان دیا تھا اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اردو مترجم کم جونیئر کلرک کے عہدے پر تقرری حاصل کی تھی مگر پھر منیش کمار سریواستو کے مقدمہ میں ایک حکم امتنائی کی وجہ سے ''ادیب ماہر'' پاس لوگ نکال دیے گئے تھے اور ہزاروں افراد کو گھر بیٹھنا پڑا تھا مگر کچھ لوگوں نے عدالت عالیہ کے دروازے پر دستک دی، جس میں پہلا فیصلہ 1998 میں عبد الرحمٰن کے حق میں ہوا اور انھیں نوکری مل گئی۔ اسی فیصلے کی روشنی میں 2006 میں ضیاء الدین کی رٹ پٹیشن بھی الاؤ (allowed) ہو گئی ہے تو مہاراج گنج کے ڈی. ایم. و ڈی. ڈی. او. کو فوراً ضیاء الدین کو اردو مترجم کم جونیئر کلرک کی پوسٹ پر بحال کرا لینا چاہیے اور 1995 سے آج تک یعنی 11 سال کی تنخواہ دی جانی چاہیے کیونکہ اتر پردیش حکومت نے ایک حکم نامہ 29 جون 2006 کو بذات خود جاری کیا ہے کہ اگر ادیب ماہر پاس اردو مترجم نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا ہو تو ان کی خدمات بحال کرتے ہوئے انھیں تنخواہ دی جائے اور یہ حقیقت ہے کہ ضیاء الدین نے بھی انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا ہے۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی سالانہ گرانٹ میں اضافہ

● سہارنپور، 31 جولائی۔ وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی سالانہ گرانٹ 12 لاکھ سے بڑھا کر 32 لاکھ کیے جانے کا حکم دیا ہے۔ گذشتہ دنوں اکیڈمی کے ایک اعلیٰ سطحی وفد نے ان کی قیادت میں لکھنؤ میں وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی تھی اور وفد نے میموریل کمیٹی کے سالانہ گرانٹ میں اضافہ اور اردو کے مسائل سے متعلق پانچ نکات پر مشتمل ایک میمورنڈم وزیر اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا تھا جس پر وزیر اعلیٰ نے اردو کے فروغ کے لیے ان کو بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ میموریل کمیٹی کے چیئرمین محمد حسن کمانوی نے بتایا کہ وزیر اعلیٰ سے وفد نے معلم اردو کو بی. ٹی. سی. کے مساوی درجہ دینے کے علاوہ یو پی میں اردو کو آٹھویں درجہ تک لازمی قرار دینے اور ضلع سہارنپور میں اردو مترجمین کی تقرری میں 1994 میں بی. جے. پی. کی سرکار کے ذریعے جو عدالتی رخنہ اندازی کی گئی تھی اس کی چارہ جوئی کرنے اور اردو مترجمین کی تقرری کا راستہ ہموار کرنے کی بھی درخواست کی ہے۔ وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے والے وفد میں کمیٹی کے چیئرمین کے علاوہ بابر خاں، ڈاکٹر محسن، پروفیسر رشید الدین ظفر، فرید جنیدی، وسیم حیدر، مولانا فرید مظاہری اور ڈاکٹر نسیم کمانوی شامل تھے۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

اردو کو روزگار سے جوڑنے میں میڈیا کا اہم رول

● میرٹھ، 14 اگست۔ '' اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے میں میڈیا انتہائی معاون رول ادا کر رہا ہے۔'' یہ خیال واشنگٹن یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی نے ظاہر کیا۔ ''عالمی منظر نامہ میں اردو میڈیا کی زبان'' پر منعقدہ ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کی وسعت کی وجہ سے اس کے ذخیرے میں دیگر زبانوں کے الفاظ کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو عالمی منظر نامہ میں اردو میڈیا کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔ سیمینار کا انعقاد جریدہ ''اسپین'' (اردو) اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے کیا تھا۔ ڈاکٹر وارثی نے صحافتی زبان میں تغیر کے اثر اور اس کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور لسانی اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو صحافت کے فروغ کے لیے مثبت فکر کا چراغ روشن کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ امریکہ میں اردو زبان اور صحافت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اردو کو فروغ دینے کے لیے میڈیا سے اس کے رشتے کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیا۔

امریکی سفارت خانے کی اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر اور اسپین میگزین کی چیف ایڈیٹر کورینا آسینڈرس نے کہا کہ اردو صحافت نے اپنی بے باکی کا پرچم بلند کر کے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ امریکی سفارت خانے میں انفارمیشن آفیسر جریمی برنم اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کے چیئرمین محمد حسن اور فلم سینسر بورڈ کے رکن مسرور احمد نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

توسیعی خطبہ ''اردو زبان کے فروغ میں مشاعروں کا حصہ''

● کولکاتا، 21 اگست۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کولکاتا اسٹڈی سینٹر کے طلبہ کی ادبی تنظیم ''بزم ادب'' کی جانب سے ایک توسیعی لکچر بعنوان ''اردو زبان کے فروغ میں مشاعروں کا حصہ'' زیر صدارت پروفیسر سلیمان خورشید منعقد ہوا جس میں اسٹڈی سینٹر کے کوآرڈی نیٹر نعیم نے نظامت کی۔ ''بزمِ ادب'' کے سکریٹری اختر حسین نے خیر مقدمی کلمات میں منور رانا کا شکریہ ادا کیا۔ اکبر مرزا نے منور رانا کی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ منور رانا نے توسیعی خطبے میں کہا کہ مشاعرے کے بغیر اردو زبان کے فروغ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم شعرا کی پہچان

مشاعروں ہی سے ہوئی تھی۔ مشاعرہ ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس کے وسیلے سے ہم غیر اردو داں طبقے تک اردو کی آواز پہنچا سکتے ہیں۔ ایک مشاعرے کا اگر سلیقے سے اہتمام کیا جائے تو وہ کم سے کم پچاس اردو سے محبت کرنے والے قاری و سامع پیدا کر سکتا ہے۔ آج کے اس فرقہ پرست دور میں اپنے پیغام کو عام کرنے کا واحد ذریعہ مشاعرہ ہے۔ تقریر کے بعد طلبہ کے اصرار پر منوررانا نے اپنے کلام سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

بیسک اردو اساتذہ ایسوسی ایشن کی میٹنگ

● آگرہ، 11 اگست۔ اردو اساتذہ ایسوسی ایشن کی میٹنگ ایشین گیسٹ ہاؤس ایم جی روڈ پر منعقد ہوئی جس میں بطور مہمان خصوصی صابر خاں ریاستی کنوینر عبدالوقار، ضلع سکریٹری میرٹھ اور محمد نوشاد ضلع صدر میرٹھ شریک ہوئے۔ صدارت محمود الزماں نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید اختیار جعفری نے انجام دیے۔ صابر خاں نے اپنے خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ اتر پردیش حکومت نے اردو زبان کے فروغ کے لیے اسکولی سطح پر کام کیا ہے لیکن اردو آبادی کے تناسب میں یہ کام کسی قدر کم ہے۔ اردو اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف حکومت کے مقصد کے تحت اردو تعلیم کو جاری رکھیں، بلکہ اس کے فروغ کے لیے متحد ہو کر کام کریں۔ اسی اتحاد کے لیے بیسک اردو اساتذہ ایسوسی ایشن کی تمام اضلاع میں شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ نظام الرحمن، معین الدین، اعزاز الدین اور دانش جمال نے بھی اظہار خیال کیا۔ دیگر شرکا میں شمس الحسن، افروز جعفری، مولوی محمد مختار، شہزاد علی، رئیس خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

بیسک اردو اساتذہ ایسوسی ایشن کی آگرہ شاخ کا قیام

● آگرہ، 13 اگست۔ ''اردو ہماری مادری زبان ہے، اس کے ہر ممکن فروغ کے لیے ہمیں از خود قدم اٹھانے ہوں گے۔ حکومت اردو تعلیم کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے ان پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔'' اس عہد کے ساتھ ہی بیسک اردو اساتذہ ایسوسی ایشن اتر پردیش کی آگرہ شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ ضلع کنوینر اور جنرل سکریٹری سید اختیار جعفری نے ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ ایسوسی ایشن اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ہر ٹیچر اس کاز کے لیے آگے آئے اور ہر ممکن قربانی پیش کرے۔ شرکا نے اس بات پر زور دیا کہ فی الحال ایک عارضی کمیٹی بنائی جائے جو 6 ماہ تک کام کرے اور جب وزارت تعلیم سے اسے منظوری حاصل ہو جائے تو اس کا دوبارہ انتخاب کیا جائے۔ اس طرح اس کمیٹی میں نظام الرحمن کو صدر، معین الدین ایڈوکیٹ اور سلطانہ بیگم کو نائب صدر، سید اختیار جعفری کو جنرل سکریٹری، اعزاز الدین قریشی، مولوی مختار احمد کو جوائنٹ سکریٹری، شمس الحسن کو سکریٹری (نشر و اشاعت) رئیس احمد کو خازن، اطہر پرویز کو آڈیٹر، محمد اسلم اور دانش جمال قریشی کو ممبران کے طور پر منتخب کیا گیا۔ (روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

کل ہند اردو کانفرنس

● حیدرآباد۔ 29 اور 30 جولائی کو کل ہند تعلیمی کمیٹی کے صدر نشین جلیل پاشا نے اردو زبان کے عمومی و تعلیمی مسائل کے حل کے لیے 28 ویں کل ہند کانفرنس منعقد کی جس میں عابد صدیقی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر سید اطہر رضا بلگرامی پروفیسر معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ دہلی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، سعید محسن باغزال، پروفیسر بدرالنسا اصغر، پروفیسر مہ جبیں میسور یونیورسٹی نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ وزیر برائے اقلیتی بہبود محمد فرید الدین نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) نے کہا کہ اردو کو نئی نسل میں متعارف کروانا وقت کی اولین ضرورت ہے۔ وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ و پاور محمد علی شبیر نے کہا کہ اردو والے اپنے مسائل کے حل کرنے میں ہوش مندی سے کام لیں۔ 30 جولائی کو مہاراشٹر، پنجاب، اتر پردیش، کیرالا کے مندوبین نے جلسے میں خطاب کیا اور اپنی ریاستوں میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی رتی چودھری ڈائرکٹر (انچارج) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس موقعے پر کہا کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور قومی اردو کونسل اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ اردو تمام ترقی یافتہ زبانوں کے برابر ترقی کرے۔ ادارے کی جانب سے زبان کو عمومی ٹکنالوجی سے مربوط کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس کے بعد آن لائن مشاعرہ منعقد ہوا۔ بعد ازاں طلبہ، اساتذہ اور شعرا کو اعزازات اور گولڈ میڈل دیے گئے۔ (ڈاک سے)

انجمن جمہوریت پسند مصنفین کا جلسہ

● موتیہاری، 31 جولائی۔ انجمن جمہوریت پسند مصنفین کا چوتھا ریاستی اجلاس مقامی اردو کتب خانہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں منشی پریم چند کے 125 ویں یوم پیدائش کے موقع پر انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس سیمینار کی صدارت فضیل احمد، اشونی کمار پردیپ اور فاروق راہب نے کی۔

سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایم ایس کالج کے پرنسپل شفیق عالم نے کہا کہ سماجی، ملی، قومی، بین الاقوامی اور عالمی مسائل کے تئیں احساس ذمہ داری اور اس فرض منصبی کی کما حقہ ادائیگی کے عہد کے لیے اس سیمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ ماتھکنڈے وکشت نے اپنے خطاب میں جمہوریت کی فضا چہار سو قائم رکھنے اور مصنفین کو اس پر ثابت قدم رکھنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد شفیع اللہ آزاد نے ''نیا ادب اور جمہوریت'' کے موضوع پر اپنا مقالہ

پیش کیا۔ دھرو ترویدی نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ ویریگیندر ڈاکٹر اروِن کمار نے تقریریں کیں۔ اختتامی کلمات وکیل عزیز ہاشمی نے پیش کیے۔

سیمینار کے دوسرے سیشن کی صدارت اشونی کمار پردیپ اور نظامت پروفیسر اروِن کمار نے کی۔ بعد ازاں شعری نشست منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر حاتم جاوید، روح الحق ہمدم، رفیع احمد آفتاب، اروِن کمار، تفضیل احمد، ڈاکٹر اختر صدیق اور فاروق راہب نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

احمد ندیم قاسمی کی یاد میں جلسہ

● نوئیڈا، 7 اگست۔ رفعت سروش کے مکان سیکٹر 44 نوئیڈا میں نوئیڈا کے سیشن جج تنویر احمد وصفی کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سب سے پہلے مختلف دانشوروں نے اردو کے مشہور شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی رحلت پر اپنے تاثرات بیان کیے۔ افسانہ نگار انور نزہت نے ان سے ذاتی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نئی نسل کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ شیخ سلیم احمد نے قاسمی صاحب کی خودنوشت کا ایک صفحہ سنایا جس میں ان کے مفلوک الحال بچپن کا ذکر تھا۔ رفعت سروش نے ایک مختصر مضمون پڑھا جس میں قاسمی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ گلزار دہلوی نے ذاتی ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے کہا کہ قاسمی صاحب اردو ادب کا ایک ستون تھے۔ بعد ازاں شعری محفل آراستہ ہوئی جس میں منور وصفی، گلزار دہلوی، رفعت سروش، فصیح اکمل، تابش مہدی، بی ایس چیتن، انور نزہت، ابرار کرت پوری، ملک زادہ جاوید، پی سریواستو رند، حی انوار زیدی، راجیش شکل سچن، سید ضمیر حسن دہلوی، حامد علی اختر اور عمیر منظر نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

احمد ندیم قاسمی اور عرشی کاظمی کی یاد میں شعری نشست

● روڑکی، 31 جولائی۔ محبان اردو روڑکی کی جانب سے احمد ندیم قاسمی مرحوم اور عرشی کاظمی منگلوری مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ایک نشست بر مکان سید انعام صابر ناز محلہ ستی میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت قاضی محی الدین سابق وزیر جنگلات (یو پی) اور نظامت انیس میرٹھی نے کی۔ اس کے بعد پہلے سے دیے گئے مصرعۂ طرح ''تو آئینہ نہیں ہے مگر ٹوٹ جائے گا'' پر شعری نشست منعقد ہوئی، جس میں انیس میرٹھی، سید انعام صابر ناز، امیر احمد سیفی، ذکریہ گوہر شمسی، بیتاب انصاری، امیر احمد فقیر، شمیم منگلوری، ابرار منگلوری، منصور منگلوری، مونس منگلوری، فصیح الزماں، محشر آفریدی، ساحل مادھوپوری، رضوان کوثر اور شکیل علوی وغیرہ نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

فصیح اکمل قادری کے اعزاز میں جلسہ

● دہلی۔ ہیومن ایلفنمنٹ اینڈ مونیویشن سوسائٹی کی طرف سے فصیح اکمل قادری کے ساتھ ایک شام کا انعقاد ہوا اس جلسے کی صدارت معروف شاعر ابوالمجاہد زاہد نے کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر وارث احمد خاں، ڈاکٹر سید ضیاء الدین، اسرار قریشی اور ڈاکٹر مغل فاروق پرواز نے شرکت کی۔ اس موقع پر اشوک ساہنی کو ایوارڈ برائے شاعری پیش کیا گیا۔

ابتدا میں سید راشد حامدی نے فصیح اکمل قادری کی حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالی شہباز ندیم ضیائی نے اس موقعے پر منظور تاثرات پیش کیے۔ فصیح اکمل قادری نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ دہلی محبتوں کی سرزمین ہے اور مجھے یہ فخر ہے کہ یہیں سے میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

پروگرام کے کنوینر حامد علی اختر تھے۔ آخر میں مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ابوالمجاہد زاہد نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ رفعت سروش، فصیح اکمل، ڈاکٹر شہپر رسول، ابرار کرتپوری، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، غالب رامپوری، معین شاداب، سید راشد حامدی، انور باری، اعجاز انصاری، ڈاکٹر مغل فاروق، اسرار قریشی، انیس احمد انیس ایڈوکیٹ، جاوید مشیری، حامد علی اختر، اقبال فردوسی، عادل رشید تاہری، اشوک ساہنی اور طارق فیضی نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

ایک صبح اردو کے نام

● نئی دہلی، 25 جولائی۔ ادب ساز لٹریری فورم کی جانب سے غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں ''ایک صبح اردو کے نام'' عنوان سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ایس ایم ظفر نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے شمالی ہندوستان میں اردو کی صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی اردو زبان و ادب کی موجودہ تعلیمی صورتحال کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ایس ایم ظفر نے ادب ساز کے مدیر نصرت ظہیر کو یقین دلایا کہ ان کی تنظیم ادب کو سنجیدہ قاری تک پہنچانے کی ان کی تحریک میں تعاون کرے گی۔ معروف شاعر متین امروہوی نے اس موقع پر اردو زبان کے حوالے سے اپنے اشعار پیش کیے۔ تقریب میں اردو طلبہ کو ادبی جریدہ ادب ساز اور ''آج'' کی جلدیں تحفے کے طور پر پیش کی گئیں۔ (''عالمی سہارا'' دہلی)

بیدر میں اردو میلہ

● بیدر۔ مغل گارڈن ہال، بیدر میں 6 اگست کو اردو تہذیبی و ثقافتی میلے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر شری منی رتپالی ای او، بیدر نے کہا کہ

اساتذہ کو چاہیے کہ طلبہ کی ہمہ جہتی نشو ونما کے لیے سخت محنت کریں۔ مہمان خصوصی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکشرداسوہا بیدر عنایت ننڈھے نے کہا کہ اساتذہ ایسے مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے طلبہ کی ہمہ جہتی رہنمائی کریں۔ ایم اے خلیل صدر کراٹا شاخ ضلع بیدر نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر حسب روایت تعلقہ بیدر کے 4 اساتذہ کو کارکردگی کی بنیاد پر کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن بنگلور شاخ بیدر کی جانب سے بہترین معلم ایوارڈ دیا گیا۔ کوئز مقابلے میں اول انعام سرکاری ماڈل پرائمری اسکول نور خاں نے حاصل کیا۔ اکرام الدین صدر اامین ضلع کمیٹی بیدر محمد عبدالقدیر سکریٹری علامہ اقبال ایجوکیشن سوسائٹی و سید منصور قادری سکریٹری ٹیلیکس ایجوکیشن سوسائٹی بی ای او بیدر کے ہاتھوں انعامات تقسیم کیے گئے۔ ("سالار" بنگلور)

ہوڑہ میں انجمن ترقی اردو کا نظم خوانی مقابلہ

● ہوڑہ، 7 اگست۔ "ترانۂ ہندی" علامہ اقبال کے سو سال پورے ہونے پر انجمن ترقی اردو ہندی شاخ شیب پور کے اراکین نے پرائمری طلبہ کے لیے نظم خوانی کے مقابلے کا انعقاد کیا جس میں 9 اسکولوں کے 34 طالب علموں نے شرکت کی اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ترنم سے پیش کیا۔

نظم خوانی کے اس مقابلے کے جج ممتاز احمد، نور پیکر، ضمیر یوسف اور شبیر اصغر تھے جب کہ صدارت ایم علی (سابق ڈپٹی مجسٹریٹ) نے کی۔ نظامت کے فرائض اشفاق حسین خاں نے انجام دیے۔ ایم علی نے کہا کہ آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسکولوں میں اقبال کے اس ترانے کو پڑھنے کے لیے بچوں کو تیار کیا جائے تاکہ بچوں کے اندر قومی جذبہ بیدار ہو۔

("راشٹریہ سہارا" دہلی)

کرناٹک اردو اکادمی کے انعامات

● بنگلور، 7 اگست۔ کرناٹک اردو اکادمی نے سال 2005 اور 2006 کے ادبی انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ انعامات اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات کے اعتراف میں دیے جائیں گے۔ اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات کے لیے انعام 10,000 روپے نقد کے علاوہ ایک شال، توصیف نامہ اور ایک یادگاریہ پر مشتمل ہے۔ انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے:

سال 2005 کے لیے: برائے شعری خدمات، محمد یعقوب یگانہ دھرم کونوی، (بھدراوتی)، برائے نثر، شِ نذیرالدین، (ہبلی) برائے صحافت، منیر احمد عادل (بنگلور)، برائے تعلیم، پروفیسر عطاء اللہ خاں، (داونگرہ)، برائے مجموعی خدمات سید مجیب الرحمن (گلبرگہ)۔

سال 2006 کے لیے برائے شعری خدمات: سلیمان خمار، (بیجاپور)، برائے نثر، جلیل تنویر (گلبرگہ)، برائے صحافت، رضوان اللہ خاں (بنگلور)، برائے تعلیم، پروفیسر آغا مرزا محمود سروش، (میسور) اور مجموعی خدمات سید احمد ایثار، (بنگلور)۔ (ڈاک سے)

اردو میں نمایاں کامیابی کے لیے طلبہ کو اعزاز

● آگرہ، 19 اگست۔ اردو زبان کی بقا کا انحصار طلبہ کو اسکول میں اردو کی تعلیم دینے پر ہے۔ اگر ہم نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ کو اردو کی تعلیم نہیں دیں تو اردو کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں رہے گی۔ ان خیالات کا اظہار اردو طلبہ کی اعزازی تقریب میں ایس این میڈیکل کالج آگرہ کے سابق پرنسپل ڈاکٹر غیاث الدین قریشی نے کیا۔ اس تقریب کا انعقاد معروف ادبی و تعلیمی تنظیم انجمن ہماری تہذیب نے کیا تھا۔ اس موقع پر یوپی بورڈ کے ہائی اسکول اور انٹر میں اردو مضمون لے کر نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے 24 طلبہ و طالبات کو اعزاز دیا گیا۔ ہائی اسکول میں مساوی نمبر حاصل کرنے والی 2 طالبات کائنات گلزار اور فرزانہ اور انٹر میں اردو کے ساتھ فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والی فرقانہ بیگم کو اردو ٹاپر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ مہمان خصوصی ذوالفقار احمد بھٹو قریشی اور آر بی ایس ڈگری کالج میں ہندی شعبے کی ریڈر ڈاکٹر سشما سنگھ نے انعامات تقسیم کیے۔ جن طلبہ کو انعام دیے گئے ان میں ہائی اسکول کی طالبات افسانہ، رضوانہ، غوثیہ ناز، نشا بانو، ثمرین بانو، عرشی جمیل، فائزہ، عنبرین بانو، افشاں اختر اور انٹر کی ارجمند فریدی، فرح ناز، بے بی سونم، شبنم مہتاب، رینہ، باسط علی، شبنم ارشاد اور فرحانہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اردو ادب کی نمایاں خدمت کے لیے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں آگرہ کی اردو ریسرچ اسکالر شابانہ پروین کو ڈاکٹر غیاث الدین قریشی اور ڈاکٹر مظہر نے اعزاز سے نوازا۔ بے بی سمیہ اور ماسٹر الہام جعفری نے مختصر نظمیں پیش کیں۔ اس موقع پر ایک شعری نشست بھی ہوئی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سید اختیار جعفری اور کشش ایٹوی نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ آخر میں انجمن کے بانی و جنرل سکریٹری نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

("راشٹریہ سہارا" دہلی)

مختصرات

● بھوپال، 25 اگست۔ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے "ابھی ویکتی" (اظہار) کے عنوان سے پروگرام کی پہلی نشست اردو افسانوں کے لیے مخصوص تھی۔ نامور افسانہ نگار اقبال مجید کی صدارت میں صبح ساڑھے 10 بجے بھارت بھون میں اس کا آغاز ہوا۔ اس میں ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار غضنفر علی نے "کڑوا تیل" کے عنوان سے افسانہ پیش کیا۔ ترنم ریاض اور ابن کنول نے بھی جلسے میں اپنے افسانے پیش کیے۔

آخر میں اقبال مجید نے ہندی اور اردو کے تخلیق کاروں کے اشتراک کو ہندوستانی ادب کے لیے فال نیک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس نئے رجحان کی وجہ سے وہ دیواریں گر رہی ہیں جو برصغیر میں فنکاروں کے درمیان حائل ہیں۔ (''ندیم'' بھوپال)

● جودھپور۔ جودھپور کی ادبی تنظیم سروکار کی جانب سے ڈاکٹر ارشد عبدالحمید (ٹونک) کے اعزاز میں واحد شاعر پروگرام انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ نے کی۔ مہمان امتیازی ڈاکٹر فرید آفریدی تھے۔ ارشد عبدالحمید کی شعرخوانی سے پہلے ڈاکٹر نثار محمد راہی اور اشراق الاسلام ماہر نے ان کی شاعری پر مقالات پیش کیے۔ اظہار تشکر کے بعد ارشد عبدالحمید نے کہا کہ ''میری شاعری کے حوالے سے جو گفتگو یہاں ہوئی وہ اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں نوجوان شعرا نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پھر انھوں نے اپنی چند غزلیں سنائیں۔ پروفیسر آزردہ نے ارشد عبدالحمید کی شاعری کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسی نشستوں سے شعرفہمی میں مدد ملتی ہے۔ سامعین کے اصرار پر انھوں نے اپنے چند اشعار بھی سنائے۔ جلسے کی نظامت برجیش عنبر نے کی۔ (ڈاک سے)

● بھوپال، 5اگست۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ ادبی نشست میں صفیہ راج علوی، رشید اختر اور فرمان ضیائی نے اپنی نظمیں اور غزلیں پیش کیں جب کہ احد پرکاش نے کہانی سنائی۔ اس موقعے پر پروفیسر شفیقہ فرحت، نسیم انصاری اور رہبر جونپوری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر نے کی۔
(ڈاک سے)

● الہ آباد، 13اگست۔ ڈاکٹر مولا بخش اسیر کے اعزاز میں ادبی و ثقافتی تنظیم ''فنکار'' کی جانب سے ادارۂ نیا سفر 28، مرزا غالب روڈ پر ایک نشست منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت اردو کے ممتاز ترقی پسند ناقد پروفیسر سید محمد عقیل نے کی اور نظامت کے فرائض عبدالقیوم شمسی نے ادا کیے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے ڈاکٹر مولا بخش کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ مولا بخش ایک نہایت ہی سنجیدہ اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے انسان ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کی ریسرچ اسکالر شیو یا دویدی نے ''لاجونتی ایک تاثر'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔
(ڈاک سے)

● کرنول۔ عثمانیہ کالج آف ایجوکیشن میں بی ایڈ ان سروس سال اوّل کونسلنگ ورک شاپ منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کرنول عثمانیہ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل کریم اللہ خاں نے بتایا کہ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نئی دہلی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے اشتراک سے پہلی مرتبہ برسرکار اردو میڈیم اساتذہ کے لیے بی ایڈ فاصلاتی طرز پر پروگرام سینٹر کرنول رکھا گیا ہے۔ یہاں اردو اساتذہ کی اعلیٰ تعلیم کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے۔ مہمان خصوصی کالج کے سابق پرنسپل امیر احمد تھے۔ اس کورس کی کوآرڈی نیٹر فہمیدہ تھیں۔ ممتاز بیگم، رام کرشنا اور شمس الدین نے تقریریں کیں۔ عبدالعلیم معلم نزل نے ڈاکومنٹشن پیش کیا۔
(ڈاک سے)

● کڈپہ۔ اسکول ڈیولپمنٹ کمیٹی نیشنل کارپوریشن اردو گرلس ہائی اسکول، کڈپہ میں جلسۂ تقسیم انعامات برائے دسویں اور بارھویں جماعت رحمت اللہ سی سری کی صدارت میں منعقد ہوا جس کے کنوینر سکریٹری ذاکر حسین تھے۔ مہمان خصوصی کے طور پر الحاج محمد احمد اللہ رکن اسمبلی کڈپہ نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اسکول کو مختلف سرگرمیوں کا ایسا مرکز ہونا چاہیے جہاں طلبہ کی صلاحیتیں فروغ پائیں اور ان کی ذہانت کو جلا ملے۔ مہمان اعزازی کے. نبی رسول ڈپٹی میئر کڈپہ نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانے اور اس کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اجلاس میں شیخ عبدالستار فیضی، سید شکیل احمد، مولوی اکبر علی رحمت اللہ خاں، اشرف علی خاں، ڈپٹی میئر نبی رسول، رحمت اللہ، الحاج احمد اللہ بادشاہ صاحب، محمد ایوب نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 17اگست۔ یوم آزادی کے موقع پر ہر سال کی طرح امسال بھی اردو اکادمی دہلی کی جانب سے پیارے لال بھون میں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت نوجوان شاعر اقبال اشہر نے کی۔ مشاعرے سے قبل دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے معروف شاعر حیات لکھنوی کے لیے دعائے مغفرت کی گئی جن کا گذشتہ دنوں انتقال ہو گیا۔ مشاعرے میں مخدوم زادہ مختار عثمانی، پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر گلزار دہلوی، منور رانا، رفعت سروش، نظمی سکندر آبادی، ساغر خیامی، جوہر کانپوری، قاسم امام، طاہر فراز، طالب رامپوری، ملک العزیز، الطاف ضیا، دنیش درپن، شہباز ندیم ضیائی، انور کمال انور، راشد علی شفا، ملک زادہ جاوید، رعنا زیبا، اسرار جامعی، انور باری، سلیم صدیقی، اقبال اشہر، صالحین فہمی، اختر نوگانوی، شاہد انجم اور ثمر نور پوری نے اپنا کلام پیش کیا۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

● دربھنگہ۔ یوم آزادی کے موقعے پر محلہ پرانی منصفی میں واقع درسگاہ اسلامی میں پروفیسر اویس احمد دوراں کی صدارت میں ''دربھنگہ ٹائمس'' (اردو پندرہ روزہ) کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ ابتدا میں پروفیسر جمال اویسی اور رہبر چندن پٹوی نے ''دربھنگہ ٹائمس'' کے خصوصی شمارے کا اجرا کیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر فاروق اعظم انصاری اور مہمان

اعزازی کے طور پر علاء الدین حیدر وارثی اور انجینئر خورشید عالم نے شرکت کی۔ مجیر احمد آزاد، اسد احمد، ڈاکٹر رضی اختر، ایوب راعین، فردوس علی ایڈوکیٹ، محمد امجد اور محمد جاوید وغیرہ بھی جلسے میں موجود تھے۔مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

اویس احمد دوراں،حسن امام درد،رہبر چندن پٹوی،کفیل احمد خاں ایڈوکیٹ،شمیم احمد باروی،علاء الدین حیدر وارثی،رفیق انجم،مرتضیٰ سنجر،انعام الحق بیدار،فاروق اعظم انصاری،جنید عالم آروی،نسیم اختر چندن پٹوی،وصال احمد،منظر صدیقی،مفتی عثمان برکاتی،امیر حسن امیر،خورشید عالم آروی، ڈاکٹر منصور خوشتر،منور عالم راہی، ڈاکٹر عقیل صدیقی،ندا عارفی اور ڈاکٹر ارشد کمال راشد وغیرہ۔ **(دربھنگہ ٹائمس، دربھنگہ)**

● دہرہ دون،26جولائی۔کائنات ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے ٹاؤن ہال میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔گورنر ریاست اترانچل سدرشن اگروال لوک آیکت اترانچل جسٹس حیدر عباس رضا اور ڈاکٹر ایس فاروق بھی اس موقعے پر موجود تھے۔اس مشاعرے میں پروفیسر وسیم بریلوی،کنور بے چین، وید دیوانہ، حامد بہرائچی، نظر ایٹوی، جلال مینش، مکیش درپن، دیوندر کافر،خوشبو شرما، رعنا تبسم،افضل منگلوری، اسلم کھتولوی، سجاد جھنجھٹ، راشد جمال فاروقی،ظہیر دانش،نسیم راجوپوری،ندیم ہمکل،ضیا نہٹوری،ندیم برنی، وکل زیبائی، زاہد دونی،اقبال آزر،شمس تبریزی اور نوین اعظم نے اپنا کلام پیش کیا مشاعرے کے کنوینر منصور رضا نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔اس مشاعرے کے ایک خوبصورت سوونیئر کا اجرا بھی کیا۔سوونیئر کی ادارت معروف شاعر راشد جمال فاروقی نے کی۔ **(ڈاک سے)**

● شملہ،20جولائی۔ بھاشا اور سنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش کی جانب سے پیٹر ہوف(Peter Hoff) ہال میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ریاستی ودھان سبھا کے اسپیکر جی۔آر مسافر نے کی۔جدید فکر وفن کے سابق شباب للت نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔اس مشاعرے میں جن شعرا و شاعرات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ شباب للت،عرش صہبائی،راہی شہابی، مہندر پرتاپ چاند، راتا سوری،کرشن کمار طور، پروفیسر خالد جاویدی،شمس تبریزی، عمران عظیم، راشد جمال فاروقی روپا صبا، آشا شیلی وغیرہ۔ ڈائرکٹر بھاشا وبھاگ پریم کمار شرما اور مدیر" جدید فکر وفن" حسنہ افروز نے مہمان شعرا و شاعرات کا شکریہ ادا کیا۔ **(ڈاک سے)**

رسم اجرا

عالمی شمع

● گلبرگہ۔" گلبرگہ کی ادبی تاریخ میں ماہ نامہ" عالمی شمع" کے اجرا سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔اس جریدے کی اہمیت اس لیے ہے کہ ایسے رسائل کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو ادب،تہذیب،فلم اور دیگر شعبہ ہائے حیات کا احاطہ کرسکیں۔" ان خیالات کا اظہار الحاج اقبال احمد سرڈگی ممبر پارلیمنٹ نے 12اگست کی شب انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ گلبرگہ کی جانب سے خواجہ بندہ نواز ایوان اردو میں" عالمی شمع" کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے ایڈیٹر" عالمی شمع" حامد اکمل کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ الکٹرانک میڈیا کے فروغ کے باجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت باقی رہے گی۔ ٹی وی چینل تفریح اور معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دوراندیشی فہم وفراست اور تدبر کتابوں اور رسائل ہی سے مل سکتا ہے۔

سابق وزیر حکومت کرناٹک الحاج قمر الاسلام نے کہا کہ حامد اکمل نے روزنامہ" سلامتی" سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔منت،ایقان جیسے اخبارات کے بعد انھوں نے" عالمی شمع" کے ذریعے ادبی اور فلمی صحافت کا آغاز کیا۔ ان کے وسیع اور گوناگوں صحافتی تجربے سے یقین ہے کہ وہ" عالمی شمع" کو ایک مکمل تہذیبی، علمی و ادبی جریدے کی حیثیت عطا کر دیتا ہے۔اس موقع پر سعادت حسین استاد نے کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم" عالمی شمع" کی اشاعت میں بھر پور تعاون کریں۔

وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکیڈمی نے اپنے خطاب میں دہلی کے ماہ نامہ" شمع" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ" شمع" نے ادب اور فلم کے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ حامد اکمل نے اس کی روایات کو پیش نظر رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔شاعر رحمن حامی نے اس موقع پر منظوم تہنیت پیش کی۔ پروفیسر محمد ہاشم علی سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ میسور نے اس جلسے کی صدارت کی۔
(ای میل سے)

روزن سے کہکشاں

● گلبرگہ، 13اگست۔جدید لب و لہجے کے شاعر خمار قریشی کے دوسرے شعری مجموعے" روزن سے کہکشاں" کی رسم اجرا بدست الحاج قمر الاسلام سابق وزیر حکومت کرناٹک انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کی جانب سے خواجہ بندہ نواز ایوان اردو گلبرگہ میں منعقدہ جلسے میں ہوئی۔ نائب صدر انجمن امجد جاوید نے مہمانان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔" روزن سے کہکشاں" کے مرتب اکرم نقاش نے خمار قریشی کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کیا۔
حامد اکمل نے کہا کہ ان کی شاعری وارفتگی کی نہیں فریفتگی کی شاعری

ہے۔ ادبی معاملات میں غبار کا معاملہ اصولوں پر استوار ہے۔ کلام میں محرومیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ پروفیسر حمید سہروردی صدر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ، سید مجیب الرحمٰن اور رحمٰن جامی نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔

الحاج اقبال احمد سرڈگی (ایم پی) نے غبار درویشی سے اپنے ذاتی تعلقات پر روشنی ڈالی۔ جلسے کی صدارت وہاب عندلیب نے کی اور نظامت کے فرائض امجد جاوید نے ادا کیے۔ (ڈاک سے)

متاعِ فکر

● بھوپال، 15 اگست۔ جشنِ آزادی کے موقعے پر بھارت ہیوی الیکٹریکلس، بھوپال کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف شاعر رہبر جونپوری کے تازہ شعری مجموعے ''متاعِ فکر'' کا اجرا سابق ممبر پارلیمنٹ اور ممتاز شاعر بیکل اُتساہی نے کیا۔ ابتدا میں بی ایچ ای ایل کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر پی ڈی دیو نے شمع روشن کی اور وجے جوشی جنرل منیجر اور صدر نے سامعین سے خطاب کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے رہبر جونپوری کی طویل ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رہبر جونپوری نے بی ایچ ای ایل بھوپال میں اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے اردو ادب کی جو قابلِ قدر خدمت کی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

تقریبِ رسمِ اجرا کے بعد کل ہند مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی صدارت بیکل اتساہی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ اس میں جن شعرائے کرام نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی مندرجۂ ذیل ہیں۔ بیکل اتساہی ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، وسیم بریلوی، عشرت قادری، زبیر رضوی، افتخار امام، رہبر جونپوری، طاہر فراز، منیل کمار تنگ، انجم رہبر، انیتا سونی وغیرہ۔ آخر میں ادبی تقریب اور مشاعرے کے کنوینر ضیاءعلی نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

خواب نگر

● ناگپور، 19 اگست۔ ''الیکٹرونک ذرائع ابلاغ کا استعمال ہمیں اردو ادب کے شاہکار دنیا بھر میں پہنچانے اور علاقائی ادبا و شعرا کو متعارف کروانے کے لیے بھی کرنا چاہیے۔ معروف انشائیہ نگار اور شاعر ڈاکٹر محمد اسداللہ کی تصنیف ''خواب نگر'' کے اجرا کے سلسلے میں منعقد ایک جلسے میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ انٹرنیٹ پر محفل نامی ویب سائٹ پر بھی یہ کتاب پیش کی جارہی ہے اس لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔''

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی اعجاز اختر، ڈائرکٹر، جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے دستِ مبارک سے کتاب کا اجرا ہوا۔ اسسٹنٹ منرل ایکونومسٹ، آئی بی ایم مجیب الدین صدیقی نے بتایا کہ اعجاز اختر انٹرنیٹ پر اردو کا پہلا یونی کوڈ فورم شروع کر چکے ہیں جس پر اردو ادب کی معیاری تخلیقات کا ذخیرہ مہیا کیا جا رہا ہے۔ اب تک وہ اس لائبریری میں اردو کی 36 کتابیں شامل کر چکے ہیں۔ اسے urdulibrary.org کے تحت انٹرنیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر غلام السیدین ربانی نے کہا کہ ''ڈاکٹر محمد اسداللہ بنیادی طور پر ایک انشائیہ نگار ہیں لیکن وہ بچوں کے لیے ڈرامے اور نظمیں بھی لکھتے ہیں، ان کے مراٹھی ادب کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر اسداللہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس کتاب میں قومی ترانہ جن گن من کا منظوم ترجمہ بھی ہے اور حب الوطنی کے دوسرے گیت بھی۔ جلسہ کی نظامت ڈاکٹر اشفاق احمد نے کی۔ (ڈاک سے)

نگاہ

● ناگپور، 20 اگست۔ جلیل ساز کے پہلے مجموعۂ کلام ''نگاہ'' کے اجرا کے موقعے پر وِدربھ ہندی ساہتیہ سمیلن۔ مور بھون میں ''جشنِ جلیل ساز'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ماہنامہ ''حیات'' اور ''نیا اُفق'' دہلی، شمیم فیضی شاعر و ادیب ڈاکٹر شرف الدین ساحل ہفت روزہ ''بے باک'' مالیگاؤں کے مدیر ہارون بی اے صحافی اینش چوبے اور مہاراشٹر وِدھان پریشد کے رکن ایس کیو زماں نے جلیل ساز کی شاعری ان کے سماجی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس جلسے کی صدارت ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے کی۔ ''نگاہ'' کا اجرا اے بی بردھن (جنرل سکریٹری سی پی آئی) نے کیا۔

رسمِ اجرا کے بعد عبدالاحد ساز کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں سرفراز کاتب، حسین واصف، خلش آکوئی، واحد انصاری، مختار یونس، نعیم اختر خادمی، محفوظ اثر، ظفر کلیم، بختیار قیسی، خضر ناگپوری، ظہیر عالم، منظور ندیم، ڈاکٹر منشا اور جلیل ساز حاجان نے اپنا کلام پیش کیا۔ عثمان غنی نے مشاعرے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

نجیب محفوظ

● قاہرہ، 30 اگست۔ نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ کا انتقال ہوگیا۔ وہ 94 سال کے تھے نجیب محفوظ ناسور کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کے خون کے دباؤ میں اچانک کمی اور گردے میں خرابی کی وجہ سے انھیں انتہائی نگہداشت یونٹ میں رکھا جا رہا تھا۔ 19 جولائی کو سڑک پر گر جانے کی وجہ سے ان کے سر میں گہرے زخم آئے تھے اور انھیں اسپتال میں داخل کرانا

بڑا تھا اور ان کے زخم کا آپریشن بھی ہوا تھا۔ نجیب محفوظ پہلے عرب مصنف تھے جنھیں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ان کی تصنیف پر ملک کے مذہبی حلقوں میں مخالفت بھی ہوتی رہی ہے اور ایک دفعہ مسلم شدت پسندوں نے ان پر حملہ بھی کیا جس میں وہ زخمی ہو گئے تھے۔

پروفیسر عبدالمغنی

● پٹنہ، 5 ستمبر۔ سرکردہ اردو ادیب عبدالمغنی کا 5 ستمبر کی صبح انتقال ہو گیا۔ وہ 70 برس کے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی کو برین ہیمرج ہوا تھا اور انھیں مقامی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ پروفیسر عبدالمغنی حالانکہ انگریزی ادب کے پروفیسر تھے لیکن انھیں اردو ادب اور عظیم شاعر علامہ اقبال پر مستند عالم کہا جاتا تھا۔ ان کے پسماندگان میں بیوی، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ انھوں نے مغل حکمراں اورنگ زیب پر بھی ایک مدلل اور تحقیقی کتاب لکھی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے کیریئر کا آغاز پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ پھر وہ یونیورسٹی پروفیسر ہوئے اور متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ وہ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کی پیدائش 4 جنوری 1936 کو اورنگ آباد ضلع میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام سید عبدالرؤف تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی غلام سرور کے بعد بہار میں اردو تحریک کے سب سے بڑے اور اہم ستون تصور کیے جاتے تھے۔ وہ ماہنامہ ''مریخ'' کے مدیر اعلیٰ تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تقریباً 50 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھیں ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں غالب ایوارڈ نیز مختلف ریاستوں کی اکیڈمیوں کے انعامات ملے ہیں۔ حکومت بہار کے محکمہ راج بھاشا کی جانب سے بھی انھیں انعام پیش کیا گیا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب درگاہ شاہ ارزاں کی جامع مسجد میں ادا ہوئی اور انھیں شاہ گنج قبرستان میں دفن کیا گیا۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی کا نام اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے یادگار رہے گا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ بہار میں انجمن ترقی اردو کو ایک انتہائی فعال ادارہ بنانا اور پھر اس کے ذریعے بہار کے ارباب سیاست کو مجبور کر کے اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنوانا قرار پائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ہندوستان میں اردو کے لیے جدوجہد میں بہار نے رہنما کردار ادا کیا ہے اور اس کا اعزاز بڑی حد تک پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کو جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کو اقبال کے پرستار کی حیثیت سے بھی یاد رکھا جائے گا۔ وہ اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے تھے اور اقبال کے خلاف ایک لفظ بھی سننا انھیں گوارا نہ تھا۔ اردو تنقید میں بھی انھوں نے ایک مخصوص روش اپنائی تھی اور وہ تازندگی اس پر گامزن رہے۔ ان کے انتقال سے اردو زبان اور ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے اور اس نقصان کی تلافی فی الحال ممکن نہیں معلوم ہوتی۔

ملک اور بیرون ملک کے دیگر بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے پروفیسر عبدالمغنی کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

بسم اللہ خاں

● بنارس، 21 اگست۔ شہنائی کی دھن پر عوام کو مسحور کرنے والے استاد بسم اللہ خاں کا 21 اگست کو علی الصبح حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔

استاد بسم اللہ خاں بہار کے بکسر ضلعے کے ڈمراؤں گاؤں میں 21 مارچ 1916 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پیغمبر بخش سمیت کنبے کے افراد کئی پشتوں سے شہنائی بجانے کے پیشے میں تھے۔ بسم اللہ خاں بچپن میں اپنے ماموں علی بخش کے ساتھ بنارس آئے اور یہیں انھوں نے شہنائی سیکھی۔

گنگا جمنی تہذیب کی حقیقی نمائندگی کرنے والے بسم اللہ خاں نے گنگا گھاٹ اور مندروں میں بھی شہنائی بجائی۔ بسم اللہ خاں نے شہنائی کا اپنا پہلا پروگرام 14 سال کی عمر میں الہ آباد میں پیش کیا 1937 میں کل ہند موسیقی کانفرنس کولکاتا میں انھوں نے شہنائی کے مقابلے میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

15 اگست 1947 کو استاد بسم اللہ خان نے لال قلعے میں جشن آزادی کے موقعے پر بھی شہنائی بجائی۔ انھیں 1956 میں سنگیت ناٹک اکادمی انعام دیا گیا اور 1963 میں شہنائی چکرورتی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے بعد 1965 میں انھیں تان سین انعام اور 1975 میں سوویت لینڈ نہرو انعام دیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ شہنائی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کے مقابلے میں آنا تو بہت دور کوئی دور دور تک ان کے پاس بھی نظر نہیں آتا جو ان کی طرح شہنائی بجاتا ہو۔

انھیں ان کی خدمات کے سلسلے میں 1961 میں پدم شری، 1968 میں پدم بھوشن، 1980 میں پدم وبھوشن اور 2001 میں بھارت رتن دیا گیا۔ بسم اللہ خان کو 1994 میں اتر پردیش حکومت نے یش بھارتی انعام بھی پیش کیا تھا۔ انھیں کاشی ہندو یونیورسٹی اور وشو بھارتی سمیت مختلف یونیورسٹیوں نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ استاد بسم اللہ خاں موسیقی کو ذات اور مذہب سے پرے سمجھتے تھے۔ بنارس میں محرم کے موقعے پر وہ ہر سال شہنائی سے ماتمی دھن بجاتے تھے۔ جس سے عوام کے اذہان میں کربلا کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی اور ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

بسم اللہ خاں موسیقی کو پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ عبادت کا ایک طریقہ تصور کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے شہنائی جو

محض شادی کی محفلوں تک محدود تھی، اسے کلاسیکی موسیقی کا ایک حصہ بنا دیا۔ گذشتہ پچاس برسوں میں انھوں نے تقریباً تمام کلاسیکی موسیقاروں کے ساتھ جگل بندی کی جن میں پنڈت روی شنکر، استاد ولایت علی خاں، استاد امجد علی خاں جیسے استادانِ فن شامل ہیں۔

انھوں نے کجری اور ٹھمری بھی شہنائی کے ذریعے موثر ڈھنگ سے پیش کی۔ استاد بسم اللہ خاں نے افغانستان، یورپ، ایران، عراق، کینیڈا، مغربی افریقہ، امریکہ، سابق سوویت یونین، جاپان، ہانگ کانگ سمیت دنیا کے تقریباً تمام اہم ممالک میں اپنی شہنائی سے لوگوں کو مسحور کیا۔

وہ عمر کے آخری مرحلے میں وہیل چیئر پر چلتے تھے لیکن اسٹیج پر پہنچتے ہی پورے جوش و توانائی کے ساتھ شہنائی کے دم پر سروں سے کھیلنا شروع کر دیتے تھے اور لوگ بس انھیں حیرت سے تکتے رہتے تھے۔

رشی کیش

● ممبئی۔ مشہور فلم ساز اور ہدایت کار رشی کیش مکھرجی ایک اسپتال میں چل بسے۔ وہ پیٹ کی بیماری میں طویل مدت سے مبتلا تھے اور انھیں اسی وجہ سے اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ 30 ستمبر 1922 کو پیدا ہوئے رشی کیش مکھرجی نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز بمل رائے کے معاون کے طور پر کیا تھا۔

1951 میں ''مسافر'' سے فلم کی ہدایت کاری کا آغاز کرنے والے رشی کیش دانے شام ساڑھے چار بجے لیلاوتی اسپتال میں آخری سانس لی۔ رشی دانے عام انسانوں سے متعلق نصیحت آموز اور کئی کامیڈی فلمیں بنائیں اور ہدایت دی۔ انھوں نے گول مال، چپکے چپکے جیسی کامیڈی فلمیں بنائیں تو آنند، ابھیمان، ملی، گڈی، نمک حرام اور ستیہ کام جیسی فلموں سے ناظرین کی تعریفیں بھی حاصل کیں۔ ان کی آخری فلم ''جھوٹ بولے کوا کاٹے'' تھی۔ مشہور فلم ساز گلزار، ریش چوپڑا، مہیش بھٹ اور فلموں میں ان کے معاون ہدایت کار ہتن تلیش نے ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

عثمان غنی

● لکھنؤ۔ قومی آواز لکھنؤ کے سابق ایڈیٹر عثمان غنی کا 25 اگست کو انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً 65 سال کے تھے۔ وہ گذشتہ چند مہینوں سے علیل تھے۔ دو روز قبل ان کی حالت تشویش ناک ہونے پر انھیں شہر کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ پسماندگان میں بیوہ اور تین بیٹیاں ہیں۔ عثمان غنی اردو کے سینئر صحافی تھے اور اس وقت لکھنؤ کے ایک اخبار ''قومی خبریں'' کے مشیر تھے۔ انھوں نے صحافتی زندگی کا آغاز ''قومی آواز'' لکھنؤ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا تھا اور ریٹائرمنٹ تک قومی آواز سے ہی وابستہ رہے۔

انجمن ترقی اردو (بہار) کی اتر پردیش شاخ کے جنرل سکریٹری محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے 'عثمانی غنی ایک ایماندار صحافی اور نیک انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک انسان کو مکمل بناتی ہیں۔

کانپور۔ ادبی تنظیم ''اسلوب'' نے عثمان غنی ہاشمی کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا جس کی صدارت بزرگ ادیب نامی انصاری نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ضیا فاروقی نے انجام دیے۔ جلسے کے شرکا میں خصوصی طور پر حیدر جعفری، ناظر صدیقی، فاروقی جائس ظفر احمد اور تسکین زیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نادم بلخی

● پٹنہ سٹی۔ ممتاز ناقد، شاعر اور محقق پروفیسر نادم بلخی کا 18 ستمبر کو جھارکھنڈ کے ضلع ڈالٹین گنج میں انتقال ہو گیا۔ وہ 78 برس کے تھے۔ مرحوم نادم بلخی کافی دنوں سے علیل تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں۔ نادم بلخی کا پورا نام محمد ابراہیم اور نادم تخلص تھا۔ خاندان بلخیہ سے تعلق رکھنے کے سبب وہ خود کو بلخی لکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن پٹنہ سٹی کے بخشی محلہ میں تھا جہاں 1928 میں ان کی پیدائش ہوئی۔ نادم بلخی نے پٹنہ سٹی کے محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول اور پٹنہ سٹی ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔اے۔ کیا۔ ان کا تقرر سب سے پہلے ٹاٹا کالج چائباسا میں بحیثیت اردو لیکچرر ہوا۔ اس کے بعد وہ جی۔ایل۔اے۔ کالج ڈالٹین گنج چلے گئے جہاں 1990 تک انھوں نے درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ مرحوم پروفیسر نادم بلخی درجنوں کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''چودہ طبق''، ''دوپہر کا دائرہ''، ''دھوپ میں صحرا نوردی''، ''نکات اربع''، ''نقطوں کا حصار''، ''دھوپ کا شاعر''، ''ذوقِ سفر'' کافی اہم ہیں۔ ہندی دوہوں میں ان کے دو مجموعے ''میٹھی میٹھی بولیاں'' اور ''جیون درشن'' کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی تنقیدی کتاب ''شعاعِ نقد'' اور عروض کی ''تفہیم العروض'' ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ نادم بلخی نے اردو میں انگریزی گرامر کی ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔

بہار اردو اکیڈمی کے سابق نائب صدر اور مقبول افسانہ نگار احمد یوسف، روزنامہ ''پندار'' کے مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر ریحان غنی، سید حسن اور سکندر احمد نے پروفیسر نادم بلخی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے اردو شعر و ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

□□□

تبصرہ و تعارف

علی وردی اور اس کا عہد
مصنف: کالی کنکر دتا/عبدالاحد خاں خلیل
صفحات: 392، قیمت: -/86 روپئے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: محمد عمر رضا، 224۔ اے، مہاندی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ 67

یہ کتاب انگریزی میں ہے جو سب سے پہلے 1939 میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں اس کا دوسرا ایڈیشن 1963 میں ورلڈ پریس پرائیویٹ لمیٹیڈ کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اس کا ترجمہ عبدالاحد خاں خلیل سے کروایا اور پہلی بار 1985 میں اردو دنیا کو اس کتاب سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ جو یقیناً ایک قابل تحسین قدم ہے۔ اردو میں اس کی مقبولیت کا عالم یہ رہا کہ بہت جلد اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا اور قومی کونسل کو 1999 میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔

اٹھارھویں صدی کا وسطی زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نازک اور بحرانی دور رہا ہے۔ اس زمانے میں دہلی کے شاہی اقتدار کی حالت ابتر تھی اور اسی پُر انتشار دور میں علی وردی خاں نے اپریل 1740 میں بنگال پر قبضہ کیا اور اپنے آخری ایام یعنی اپریل 1756 تک بنگال پر حکومت کی۔ علی وردی کا یہ دورِ حکومت جو سولہ سال کے عرصے پر محیط ہے، صوبۂ بنگال کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر بھی اس عہد کی تاریخ کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں کا مکمل طور پر مطالعہ بہت کم کیا گیا ہے۔ کالی کنکر دتا نے اپنی اس کتاب میں اٹھارھویں صدی کے ان تمام پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے جس کا مطالعہ تاریخ کے طلبہ کے لیے ضروری ہے۔

پہلے دو ابواب میں مصنف نے علی وردی کی ابتدائی زندگی، صوبے داری کے عہدے پر فائز ہونے اور اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے پر بحث کی ہے۔ تیسرے باب میں بنگال پر مرہٹوں کے حملوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ان حملوں سے بنگال کی تاریخ پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوئے، ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا باب بہار میں افغان بغاوتوں کے ذکر پر مشتمل ہے اور ان بغاوتوں سے صوبۂ بنگال کی تاریخ نیز شمالی ہند کی تاریخ پر جو مجموعی اثرات مرتب ہوئے، ان کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں علی وردی خاں اور بنگال کے انگریز تاجروں کے باہمی تعلقات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چھٹے باب میں علی وردی کے احوال و کوائف اور عہد حکومت کے خاتمے پر رائے زنی کی گئی ہے۔ ساتواں باب بنگال کے مختلف تجارتی پہلوؤں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس باب کو کالی کنکر دتا نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ایشیائی تجارت، دوسرے حصے میں صوبوں کی باہمی تجارت اور تیسرے حصے میں انگریزوں کے کارخانوں اور ان کارخانوں پر لگائے گئے انگریزوں کے سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں بنگال کے عام اقتصادی حالات کے مختلف پہلوؤں — مثلاً زراعت، بازار، چیزوں کی قیمتیں اور صنعتی و حرفتی کاروبار کا حال مفصل بیان کیا گیا ہے۔ نویں باب میں بنگال کے باشندوں کی معاشرتی زندگی، ان کے عادات و اطوار اور رسم و رواج کی قدرے ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے۔ دسویں باب میں مصنف نے ''اختتامیہ'' کے تحت علی وردی کے عہد کی اہمیت و افادیت اور خوبیوں و خامیوں کو دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں آخر میں جو ضمیمے پیش کیے گئے ہیں، وہ بھی معلوماتی ہیں۔

چوں کہ علی وردی کے دورِ حکومت میں بنگال بظاہر تو ترقی و فلاح کی جانب گامزن تھا، لیکن سیاسی طور پر کافی منتشر رہا۔ مصنف نے اس کی وجہ علی وردی کے غاصبانہ رویے کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''جو اقتدار دغا بازی اور سینہ زوری سے حاصل کیا جاتا ہے، کسی غاصب مہم پسند یا اس کے خاندان کے لیے کبھی قلبی سکون و راحت اور مسرت کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ علی وردی کی زندگی اس کی روشن مثال ہے۔''

مجموعی طور پر کالی کنکر دتا کی یہ کتاب ''علی وردی اور اس کا عہد'' ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ عبدالاحد خاں خلیل نے جس انداز میں بنیادی متن کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ زبان کافی رواں اور تصنع سے پاک ہے۔ امید ہے قارئین اس بیش بہا اور اہم تاریخی کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

اردو کی کہانی/سید احتشام حسین
صفحات: 105، قیمت -/32 روپئے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: عبدالرب، 164 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 110006

پروفیسر سید احتشام حسین نے اردو زبان و ادب کی دو تاریخیں لکھی ہیں ''اردو کی کہانی'' اور '' اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''۔ یہ دونوں کتابیں اپنے

موضوع اور مواد کے اعتبار سے بہت مقبول ہوئیں۔اول الذکر کتاب بچوں اور کم تعلیم یافتہ بالغوں کی ضرورت اور ذہنی سطح کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ احتشام صاحب 53-1952 میں امریکہ گئے تھے اور وہاں ہارورڈ یونیورسٹی میں مشہور ادیب آئی۔اے۔رچرڈس سے ملے تو انھیں خیال آیا کہ بچوں کو اپنی زبان کی تاریخ اور ادب سے واقف ہونا چاہیے۔ اردو میں اس نوع کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ انھیں اس کمی کا شدت سے احساس ہوا اور یہی احساس اس کتاب کی تصنیف کا سبب بنا۔

احتشام حسین نے ''اردو کی کہانی'' میں نہایت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں اردو زبان وادب سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور تاریخی ترتیب سے ادبی تاریخ کے بیشتر موضوعات کو شامل مطالعہ کرنے کی حتی الامکان سعی کی ہے۔مصنف نے اردو زبان کی ابتدا اور اردو کے ماخذ کے بارے میں مختلف نظریات کو پیش کرتے ہوئے بڑے دلنشیں انداز میں واضح کیا ہے کہ اردو زبان کا ماخذ کھڑی بولی ہے۔اسی طرح انھوں نے دکن کی ادبی تاریخ کو چند صفحات میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے متعلق تمام معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

دلی میں اردو شاعری کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے عہد میر وسودا سے متعلق گرانقدر معلومات فراہم کرتے ہوئے مصنف نے اس عہد کے بیشتر اہم شاعروں کا تذکرہ بھی شامل کیا ہے علاوہ ازیں دبستان لکھنؤ کی خصوصیات کے لیے بھی ایک باب مختص کیا گیا ہے جس سے دلی اور لکھنؤ کی ادبی فضا اور رنگ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

نثر کی ترقی سے متعلق باب میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ دکن اور شمالی ہند کے تمام اہم رسائل وکتب کا ذکر کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج اور اس کے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز جب انگریزی ادب سے اخذ و استفادے کی راہیں کھلیں اور براہ راست اردو ادب پر اس کے اثرات مرتب ہوئے تو ادب میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، کتاب میں اس کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

مصنف نے کوشش کی ہے کہ ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک اردو ادب کے ارتقائی سفر سے اسکولی سطح کے طلبہ سرسری طور پر ضرور واقف ہو جائیں۔ لیکن یہ کتاب حقیقت میں اتنی اہم ہے کہ بچے اور بڑے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

کتاب میں شامل کم وبیش ساٹھ ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مینلو پارک کا جادوگر (بچوں کی کہانی)
مرتبین: ایس.بی. بھٹا چاریہ، اے.کے. چکرورتی
مترجم: سید منصور آغا
قیمت: 23روپے صفحات: 104
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: عبدالرحمن مظہری، 1، لوہت ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔110067

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ کوشش رہی ہے کہ بڑوں کے ساتھ بچوں کے ادب پر بھی توجہ دی جائے، ان کو معیاری کتابیں فراہم کی جائیں، جس سے مستقبل کے ان معماروں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو سکے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے سائنس داں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو عجیب وغریب شخصیتوں کا مالک تھا۔ جو کبھی دوکاندار، کبھی صحافی، کبھی مفلس، قلاش اور بعد میں دولت مند سائنس داں بنا۔ ان کا نام تھامس الوا ایڈیسن ہے ان کی پیدائش 11 فروری 1847 کو امریکہ میں شہر ملان کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔

ایڈیسن کو بچپن سے ہی مختلف چیزوں کی حقیقت جاننے کا شوق تھا۔ اور ہمیشہ نئی نئی چیزوں کی کھوج میں کھویا رہتا تھا اور پڑھائی کے روایتی طریقے سے بھی دور بھاگتا تھا۔ ایک دفعہ جب استاد نے ڈانٹا تو وہ اسکول چھوڑ کر اپنی ماں سے تعلیم حاصل کرنے لگا۔ کتابوں سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ محض دس سال کی عمر میں اعلیٰ درجے کی کتابوں کو پورا پڑھ لیا۔ اسے سائنس سے گہری دلچسپی تھی۔ سائنس کی کتابوں میں وہ جو کچھ پڑھتا، اسے عملی تجربہ کر کے دیکھتا۔ الوا ایڈیسن نے اپنے گھر میں ہی ایک تجربہ گاہ قائم کر لی تھی۔ تجربے کے سامان کے لیے جب الوا ایڈیسن کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس نے ایک ٹرین میں اخبار اور کھانے کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں خود ایک ہفتہ وار اخبار'' ویکلی ہیرالڈ'' نکالنا شروع کیا جو کہ اسی چلتی ٹرین میں چھپتا اور اسی میں فروخت ہوتا۔ اس اخبار کا مالک، ایڈیٹر، رپورٹر اور تقسیم کار سب اکیلے'' الوا ایڈیسن'' ہی تھا۔ اس کی ادارت میں یہ اخبار بہت جلد مقبول ہو گیا تھا۔

ایڈیسن کی بہت سی ایجادات کے پیچھے کوئی واقعہ، مشکل یا کوئی چیلنج سامنے رہا جس کے حل سے نئی نئی چیزوں کا وجود ہوا۔ جیسے : Cocrochexterminator جس کے ذریعے کاکروچ کو مارا جاتا ہے۔ نئی چھپائی مشین (یونیورسل پرنٹر)، تجارتی ٹیلی فون، بولنے والی مشین (فونوگرام) یہ آواز کو ریکارڈ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ آواز کو ریکارڈ کرنے کا تصور اس

وقت کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایڈیسن نے اپنے اس خیال سے دوستوں کو آگاہ کیا تو لوگوں نے اسے پاگل سمجھا اور جب مشین تیار ہوگئی تو لوگوں نے اس مشین کو جادو سے تشبیہ دی اور ''ایڈیسن'' کا لقب 'منیلو پارک کا جادوگر' ہوگیا جہاں وہ رہتے تھے۔

اس کے علاوہ ''ایڈیسن'' نے ریلوے اور پلیٹ فارم کے درمیان اور بحری جہاز کے درمیان تار کے ذریعے پیغام پہنچانے کا نظام ایجاد کیا۔ فلم سازی، مووی کیمرہ، بجلی کا بلب، بجلی کا گھر اور بجلی کے ذریعہ چلنے والا انجن بھی ایڈیسن ہی کی ایجاد ہے۔

''ایڈیسن'' کی ایجادات کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کرگئی ہے جس میں ایک بڑی تعداد ان کل پرزوں کی ہے جو اپنے بجلی کے گھر کے لیے اس نے ایجاد کیے تھے۔

کتاب میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کہانی [illegible] سے ترجمہ کی گئی ہے۔ لیکن سید منصور آغا نے جس مہارت کے ساتھ اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اس سے ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کو پسند آئے گی اور وہ بجلی سے متعلق مختلف ایجادات سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

اردو ناول کے اسالیب

مصنف: شہاب ظفر اعظمی

قیمت: -/135 روپے، صفحات: 425

ناشر: مصنف۔ شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ 800005 (بہار)

مبصر: رئیس احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 110066

شہاب ظفر اعظمی کی یہ کتاب اردو ناول کے اسلوبیاتی مطالعے سے متعلق بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں مصنف نے اردو ناول کے اسالیب پر خاطر خواہ بحث کی ہے، اردو ناول کے بتدریج تاریخی و ارتقائی سفر کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ نتیجتاً اردو ناول کے اسلوبیاتی مطالعے کی ایک مبسوط تاریخی دستاویز منظر عام پر آگئی ہے جس کے تناظر میں اردو فکشن کی دیگر اصناف کے اسلوبیاتی اور تنقیدی مطالعے کے لیے بھی راہ ہموار ہوسکے گی۔

پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا باب— ''اسلوب اور اردو ناول'' ہے جس میں ''اسلوب'' کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے مختلف اصحاب قلم کی آرا پیش کی گئی ہیں جن کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اسلوب کی تشکیل میں مصنف کے گرد و پیش کے احوال بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ بعد ازاں اردو ناول کے مختلف اسالیب پر قلم فرسائی کی گئی ہے۔ اس مختصر سی بحث میں زبان و بیان اور اسلوب کے تعلق سے اردو ناول کا فنی تجزیہ بھی اجمالاً پیش کیا گیا ہے اور ضمناً اردو ناول سے قبل اردو داستانوں اور قصے کہانیوں کے اسالیب بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔

دوسرا باب— ''اردو ناول کے اسالیب— ترقی پسند تحریک سے پہلے'' ہے جس میں ترقی پسند تحریک سے قبل لکھے گئے اردو ناولوں کے اسالیب کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے، اس باب میں جن معروف اور غیر معروف ناول نگاروں کو شامل کیا گیا ہے ان میں مولوی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، خواجہ الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی، نواب فضل الدین، سجاد حسین انجم، منشی سجاد حسین، قاری سرفراز حسین عزمی، آغا شاعر، حکیم محمد علی طبیب، علامہ راشد الخیری، مرزا محمد سعید، نیاز فتح پوری، کشن پرشاد کول، علی عباس حسینی، مرزا عباس حسین ہوش، سجاد مرزا بیگ دہلوی، ہمایوں مرزا، پریم چند، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، عظیم بیگ چغتائی، فیاض علی، ل۔ احمد اور محمد مہدی تسکین وغیرہ ہیں۔ اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے متذکرہ جملہ ناول نگاروں کے ناولوں کا انفرادی طور پر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ مطالعہ محض اسلوبیاتی مطالعے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں زیر بحث ناولوں کا فنی تجزیہ بھی شامل ہے جس میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور پلاٹ کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے اور قصے کی مقصدیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب— ''ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب'' سے متعلق ہے جس میں سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کو شامل کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس باب کے آغاز میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد پر بھی اجمالاً توجہ صرف کی ہے اور اسی تناظر میں ترقی پسند ناولوں کا جائزہ لیا ہے، ترقی پسند ناول نگاروں کے یہاں حقیقت پسندی اور مقصدیت کو زبان و بیان پر ترجیح حاصل ہے۔

چوتھا باب— ''اردو ناول کے اسالیب— ترقی پسند تحریک کے بعد'' پر محیط ہے۔ اس باب میں عزیز احمد، احسن فاروقی، قرۃ العین حیدر، فضل احمد کریم فضلی، شوکت صدیقی، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، حیات اللہ انصاری، جمیلہ ہاشمی، ممتاز مفتی، قاضی عبدالستار، سہیل عظیم آبادی، علیم مسرور، جیلانی بانو، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، صلاح الدین پرویز، بانو قدسیہ، جوگیندر پال، نعیم اعظمی، غضنفر، عشرت ظفر، مظہر الزماں خاں، عبدالصمد، پیغام آفاقی، حسین الحق، شموئل احمد، علی امام نقوی، الیاس احمد گدی، گیان سنگھ شاطر، مشرف عالم ذوقی، اقبال مجید، سید محمد اشرف، ساجدہ زیدی، یعقوب یاور، کوثر مظہری، شفق، محمد علیم، آچاریہ شوکت خلیل اور شاہد اختر جیسے نمائندہ اور غیر نمائندہ ناول نگاروں کو شامل مطالعہ کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب

نے باب کے آغاز میں تقسیم ہند اور ترقی پسند تحریک کے زوال کی جانب واضح اشارے کیے ہیں اور اس عہد میں لکھے جانے والے ناولوں کے موضوعات مثلاً فرقہ وارانہ فسادات،طبقاتی کشمکش اور ہجرت کے علاوہ مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ان موضوعات کا اثر براہ راست ناول نگاری کے اسلوب پر پڑا جس کے نتیجے میں موجودہ عہد تک آتے آتے ناول نگاری کا یہ منفرد اسلوب واضح اور سپاٹ ہوتا چلا گیا۔ پانچواں باب حاصل کلام پر مشتمل ہے جس میں '' محاکمہ '' کے تحت مذکورہ ابواب کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

مختصراً یہ کہ شہاب ظفر اعظمی کی یہ کتاب اردو ناول کی اسلوبیاتی تنقید اور اسلوبیاتی مطالعے کے حوالے سے ایک عمدہ پیش کش ہے۔اس کی اشاعت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا جزوی مالی تعاون بھی شامل ہے۔

جب گاؤں جاگے/شبر امام

صفحات: 642، قیمت:-/300 روپے

ناشر: کتابی دنیا، ترکمان گیٹ دہلی۔110006

مبصر: محمد عمر رضا، 224۔ اے ماہانڈی، جے این یو، نئی دہلی۔110067

'' جب گاؤں جاگے'' شبر امام کا دوسرا ناول ہے جو موضوع کے اعتبار سے کافی اہم اور فکر انگیز ہے۔ اس ناول میں شبر امام نے گاؤں اور شہر کے مختلف کرداروں کے ذریعے گاؤں میں صحت مند تبدیلی لانے کی کوششوں کو بڑے تفصیلی، جذباتی اور مثالی انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے سیاسی،سماجی، اخلاقی اور معاشرتی انقلاب کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ رمضان پور گاؤں کے انور حسین کا بیٹا ریاض آئی اے ایس افسر بن جاتا ہے تو اودھ بہاری پرشاد ٹھاکر کی دو اولادوں میں سے ایک یعنی سندر پڑھ لکھ کر ایگری کلچر سائنٹسٹ بن جاتا ہے۔ یہ دونوں مل کر گاؤں کا نقشہ بدلنے کے لیے رات دن ایک کر دیتے ہیں۔خاص طور پر سندر کے والد اودھ بہاری پرشاد ٹھاکر اس لیے خفا ہیں کہ ان کا بیٹا ٹھاکر ہوتے ہوئے بھی مزدوروں، کسانوں اور ہریجنوں کے ساتھ کام کرتا ہے اور انھیں ایک نئی راہ دکھا کر دیگر باوقار لوگوں کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ سندر کے نزدیک ذات، مذہب اور اونچ نیچ کی کوئی پابندی نہیں۔ اس کے مطابق ایک برہمن، چھتریہ، ٹھاکر اور سید بھی اسی طرح ضرورت مند ہو سکتا ہے جس طرح ہریجن ہوتے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ کے نیاز حسین عرف چودھری کی بیٹی شاہینہ لندن سے ڈاکٹر بن کر آتی ہے لیکن وہ ہندوستان کی پسماندگی اور غربت کو لے کر چوں کہ ہمیشہ سے فکر مند رہی ہے، اس لیے ہندوستان آنے کے بعد وہ گاؤں میں ہی دلچسپی لینے لگتی ہے۔اس طرح ناول نگار نے گاؤں میں ہو رہی صحت مند تبدیلیوں کو اس انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے جس سے ہمارے نوجوان اپنی تعلیمی صلاحیت و قابلیت کا صحیح استعمال ہندوستان کے ان پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ گاؤں میں بھی کریں جہاں مفاد اور موقع پرست سیاسی لیڈروں اور بابوؤں کی کرم فرمائیوں کے سبب بے بسی اور لاچاری ہے۔

ناول میں ایسے کرداروں سے بھی متعارف کرایا گیا ہے جو نہایت خود غرض، لالچی، دھوکے باز اور موقع پرست ہیں۔ مثلاً نیاز حسین عرف چودھری اپنے پاگل بیٹے کا عقد طاہر حسین کی بیٹی رضیہ سے کروادیتا ہے اور کافی جہیز بھی لے لیتا ہے۔لڑکا عقد ہو جانے کے بعد واپسی میں حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے اور رضیہ بیوہ ہو جاتی ہے، اس لیے ناول نگار نے ایسے پڑھے لکھے نوجوان کرداروں سے بھی ملاقات کرائی ہے جو رضیہ جیسی بیواؤں کا سہارا بنتے ہیں۔ مثلاً ریاض کا دوست حامد جو کہ بہت جلد جج بننے والا ہے، رضیہ سے شادی کر لیتا ہے۔

سندر اور رجنی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ سندر تعلیم مکمل کرنے کے بعد گاؤں میں فلاحی کام تو شروع کرتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سماج کے طبقاتی اور ذات پات کے نظام کو عملی طور پر ختم کرنے کی غرض سے رجنی سے شادی بھی کرتا ہے جو ایک ہریجن کی بیٹی ہے۔ رجنی سندر کے بچے کو جنم دے کر انتقال کر جاتی ہے اور اسی پر یہ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

رجنی کے ذریعے شبر امام نے ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جو گاؤں کی ایک معمولی اور جاہل ہونے کے باوجود سندر اور ریاض کی فلاحی کوششوں سے متاثر ہو کر مہذب اور تعلیم یافتہ بن جاتی ہے اور مردوں کے شانہ بشانہ چلنا چاہتی ہے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ ناول بہت عمدہ ہے اور اس میں سماجی، اخلاقی، مذہبی اور قومی یکجہتی پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی طوالت ضرور کھٹکتی ہے۔ کہیں کہیں زبان بھی غیر معیاری استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً '' میرے کان کھڑے ہو گئے'' کی جگہ '' میرا کان کھڑا ہو گیا''، '' ساتھ لے کر'' کی جگہ '' شامل لے کر'' اور '' وجہ سے'' کی جگہ '' وجہ کر'' لکھا گیا ہے۔ مزید پروف کی بھی غلطیاں ہیں— '' فرصت'' کو '' فرست''، '' مطالعہ'' کو '' مطالع''، '' طبقہ'' کو '' طبقع''، '' تہہ خانہ'' کو '' تحہ خانہ''، '' برخاست'' کو '' برخواست''، '' اصرار کرنا'' کو '' اسرار کرنا'' اور '' افراتفری'' کو '' افراح تفریح'' وغیرہ لکھا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر پلاٹ، کردار، مکالموں اور قصوں کے منطقی ربط نے ناول کو کافی حد تک مکمل اور کامیاب بنانے میں خاص کردار ادا کیا ہے جس سے ناول نگار کی فنی چابکدستی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بھوپال میں اردو انضمام کے بعد/محمد نعمان خاں

صفحات: 632، قیمت: -/500 روپے

ناشر: مصنف، 103 تھرڈ فلور، لین نمبر 3، جوہری فارم، اوکھلا، نئی دہلی۔25

مبصر: جاوید عالم، 10۔مرفی بازار، جہانگیر آباد، بھوپال (ایم پی) 462008

بھوپال کو ہمیشہ ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھوپال اکثر اہل نظر کے التفات سے محروم رہا۔ چنانچہ اردو کے مختلف مراکز سے متعلق معلومات وتصنیفات بالعموم دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن اس حوالے سے بھوپال کے بارے میں کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی، سوائے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم کی کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' کے، جو جنوری 1965 میں شائع ہوئی تھی جس میں ریاست بھوپال کے انضمام تک کے ادب کا جائزہ لیا گیا تھا۔

''بھوپال میں اردو: انضمام کے بعد'' ڈاکٹر محمد نعمان خاں کی تصنیف ہے جس میں 1949 سے 1985 تک بھوپال میں اردو کی صورت حال کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ان تمام لوگوں کا تذکرہ شامل ہے، جو بیت الکمال، بھوپال میں رہ کر اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف رہے ہیں۔کتاب کو کل سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔باب اول بھوپال کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، تہذیبی، سماجی، علمی، ادبی اور تعلیمی پس منظر کا احاطہ کرتا ہے۔باب دوم میں انضمام سے پہلے بھوپال میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم تا ششم مابعد انضمام (1949) بھوپال میں اردو کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ ان چار ابواب میں نظم ونثر کی مختلف اصناف کا سیر حاصل تجزیہ شامل ہے۔ بچوں کے ادب و شاعری سے بھی بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم بھوپال کی اردو صحافت سے متعلق ہے۔

صاحب تصنیف نے اردو ادب کے ایک اہم مرکز کی تاریخ مرتب کرنے میں دس سال تک جانفشانی سے کام کیا ہے اس لیے کتاب میں بھوپال کے ادبا وشعرا سے متعلق خاصی تفصیلات یکجا ہوگئی ہیں۔ نیز اس سے یہاں کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے بارے میں اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے بھوپال کی ادبی وثقافتی تنظیموں کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب کی طباعت صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔بھوپال کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایات و خدمات سے واقفیت حاصل کرنے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

سرحدوں کے بیچ/آنند لہر

صفحات: 80، قیمت: -/100 روپے

ناشر: ملک بکڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی۔110006

مبصر: مخمور سعیدی، بی۔3/141 سی، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی۔92

آنند لہر ایک معروف کہانی کار ہیں۔زیر نظر تحریر کو بھی ایک طویل کہانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ کہانی کے بعض لوازم سے عاری ہے لیکن اسے کہانی ہی کی طرح دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔موضوع زمینی تقسیم کا وہ عمل ہے جو مصنوعی سرحدوں کو جنم دیتا ہے اور جس کے نتیجے میں سرحدوں کے دونوں طرف رہ جانے والوں کو غیر انسانی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آنند لہر نے اس غیر انسانی صورت حال کو موضوع بنا کر اس کی المناکیوں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے اور اس کی وجہ سے انسانی رشتے جس شکست و ریخت کا شکار ہو سکتے ہیں اس کی نشاندہی کی ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی ہے جو اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی ایک ناگزیر ضرورت کی تکمیل کے لیے سرحد کی وہ لکیر پار کر جاتی ہے جس کے وجود اور اہمیت سے وہ بے خبر ہے۔وہاں پڑوسی ملک کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں، اسے دشمن کا جاسوس قرار دے کر اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اسے طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ وہ اپنی بے گناہی پر مصر ہے لیکن بالآخر اس کی قوت مزاحمت جواب دے جاتی ہے اور وہ ان بہت سے لوگوں کے مشورے پر جو جرم بے گناہی کی سزا کاٹ رہے ہیں، اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر لیتی ہے۔ اس طرح اسے تفتیش کے اذیت ناک عمل سے چھٹکارا ملتا ہے اور وہ حوالات سے جیل میں منتقل کر دی جاتی ہے۔

جیل میں ایک نو وارد نوجوان افسر سے اس کا جذباتی اور پھر جسمانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔وہ حاملہ ہو جاتی ہے اور جیل ہی میں ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔سزا کی مدت پوری ہو جانے پر جب اسے رہا کیا جاتا ہے تو اس کے نومولود بچے کی شہریت کا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔کہانی کی آخری سطریں یہ ہیں:

''بچہ جب رانی کے ساتھ جانے لگا تو اس ملک کے سپاہیوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس کے لیے حکم نہیں ہے......

پھر بچہ جب ادھر آنے لگا...... تو اس طرف کے سپاہیوں نے اسے روک لیا اور کہا اس کے لیے حکم نہیں ہے۔''

''سب دیکھ رہے ہیں کہ سرحد کے ایک طرف رانی [کہانی کا مرکزی نسوانی کردار] کھڑی ہے اور دوسری طرف راجا [مرکزی مرد کردار]۔ دونوں اپنے اپنے ملک کی سرحد میں کھڑے ہیں اور درمیان میں ایک بچہ کھڑا ہے جس کا کوئی ملک نہیں ہے۔''

کتاب کے دیباچے میں سید معصوم رضا نے آنند لہر کی اس کاوش کو ناول قرار دیا ہے جس سے اتفاق مشکل ہے۔ کتاب کی قیمت واجبی سے کہیں زیادہ ہے۔ ناشرین جو عام طور پر کتابوں کی کساد بازاری کے شاکی رہتے ہیں انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی مطبوعات کی قیمتیں واجبی ہوں۔

□□□

تحریر: ایرا سکسینہ
ترجمہ: صفدر نقوی

ہماری مطبوعات سے

''ہمارے رہنما'' سے ماخوذ

رفیع احمد قدوائی

زندگی کی ہماہمی سے دور، گرد کے دھند میں گھرا، مسولی، ضلع بارہ بنکی کے بے تاج بادشاہ، رفیع احمد قدوائی کا ''محل'' کھڑا ہے۔ یہ محل ایک میدان میں کھڑا تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا مکان جس کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہ تھیں۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے اینٹوں کے کھمبوں پر کھڑا ایک برآمدہ تھا۔ اس کی حالت پکار پکار کر مرمت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اصلی گھر کے آگے ایک چھوٹا سا ٹین کا سائبان تھا۔ وہاں کچھ اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ آم اور امرود کے کچھ درخت تھے۔ ایک اکیلا لیمپ کا کھمبا، اس بات کی نشانی تھی کہ یہ داخلے کا دروازہ ہے۔ یہ تھا وہ مکمل ''شاہی'' احاطہ۔ اور بس۔

''یہ'' ان سے قریبی تعلق رکھنے والے گاؤں کے ایک شخص نے کچھ بے یقینی کے ساتھ کہا۔ ''قدوائی، جو اپنی دولت ان لوگوں پر نچھاور کر دیتے تھے جو ان سے مدد چاہتے تھے لیکن جہاں تک خود اپنے پر خرچ کرنے کا سوال ہے وہ بہت جزرس تھے۔''

ایک دوست، جو ایک بینک کا ڈائرکٹر تھا لکھنؤ سے جنازے کے ساتھ آخری رسوم میں شرکت کے لیے ساتھ گیا تھا۔ اس نے اپنے گلے کو صاف کیا اور کہا ''ان کا انتقال ہوا تو وہ مقروض تھے۔'' یقیناً یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔'' ''گھبرائیے نہیں۔ ہمیں جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی، ڈائرکٹرس کے بورڈ نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ان کی طرف بینک کا جو حساب تھا، اسے قلم زد کر کے ختم کر دیا جائے۔ ہر شخص واقف تھا کہ اس نیک شخص نے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کیا تھا۔

زبردست مجمع میں بہت سی باتیں لوگوں نے بتائیں۔

''میاں مرحوم نے کتنے بچے چھوڑے۔'' کسی شخص نے پوچھا۔

''کہتے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے اٹھ جانے سے ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

کسانوں اور پارلیمنٹ کے لوگوں کا یکساں سرپرست، رفیع احمد قدوائی، مسولی کا ''بے تاج بادشاہ'' تھا۔ وہ آزادی کی جدوجہد کا سچا سپاہی تھا۔ بہترین منتظم تھا، صحیح معنوں میں قوم پرست تھا جس کا مذہب لوگوں سے محبت کرنا تھا۔

ایک چھوٹے قد کے، سفید کھدر کا کرتا پائجامہ، ایک جھریاں پڑی دودھیا رنگ کی اچکن اور ایک گاندھی ٹوپی اوڑھے تیز تیز قدموں سے چلتے گھر سے باہر آتے تھے۔ ان کے ساتھ دوستوں اور ہمنوا لوگوں کی لمبی لائن ہوتی تھی۔ ان لوگوں میں ہلکی پھلکی بات چیت اور ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔

> جن لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ لگا دیا اور آزادی ملنے کے بعد اسے کامیاب کرنے میں لگے رہے، ان کی فہرست میں رفیع احمد قدوائی کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا رہے گا۔
>
> **مولانا ابوالکلام آزاد**

تقریباً ساڑھے سات سو برس پہلے مستان شاہ، قاضی قدوا کے خاندان سے ایک عالم تھے۔ انھوں نے ضلع بارہ بنکی میں گاؤں مسولی آباد کیا۔ رفیع احمد قدوائی کے پردادا ظہیر الدین عرف گھرن میاں کو ان کی نیک طبیعت اور نواب اودھ سے عقیدت کی وجہ سے عوام بہت پسند کرتے تھے۔ چھدا میاں، ان کے بھائی جو بہادری کے لیے بہت مشہور تھے، انھوں نے قومی خدمت میں جان دے دی۔ یہ خاندان بارہ بنکی کے قدوائی خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔

18 فروری 1894 کی ایک سرد صبح کو قاضی صاحب کے خاندان کے

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ یہ مضمون قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''ہمارے رہنما'' جلد ہشتم سے ماخوذ ہے۔ اس جلد میں دیگر شخصیات جیسے بپن چندر بوس، کستوربا گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل، ونوبا بھاوے، شیاما پرساد مکرجی اور ہومی جہانگیر بھابھا کے احوال و کوائف اور حیات و خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ''ہمارے رہنما'' جلد ہشتم 161 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت -/35 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ایک فرد ممتاز علی بے چینی کے ساتھ اپنے پہلے پوتے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ممتاز علی کے بیٹے امتیاز علی کو مسولی کے لوگ پیار میں لالہ میاں کہتے تھے۔ امتیاز علی بھی اپنے بزرگوں کی طرح فراخ دل تھے۔ ان کی بیوی رشید النسا بھی ان ہی کی طرح شریف تھیں۔ ان بےچینی کے لمحات میں ممتاز علی نے اپنے ذہن کو بٹانے کی کوشش کی۔ صحن میں غلے کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ روز مرہ کے کام کی طرح وہ اسے دیکھنے لگے۔ یکا یک تھالی بجنے کی آواز نے پریشانی کو ختم کر دیا۔ دائی نے رفیع احمد کی پیدائش کا اعلان کیا۔ ممتاز علی نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور دعا کی کہ اس پوتے کو لوگوں کی محبت ملے۔

رفیع احمد نے ابتدا ہی سے اپنے بزرگوں کے اثرات کا اظہار کیا۔ وہ شریف بچے اور کھرے تھے۔ ان کے بچپن ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے والد نے دوسری شادی کی۔ رفیع احمد اپنی سوتیلی ماں کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنے بھائیوں شفیع احمد اور محفوظ احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی کسی نے انھیں غصے میں بھڑکتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ کھیل اور کشتی میں بھی انھیں غصہ نہیں آتا تھا۔

دولت مند زمینداروں کے لڑکے آپسی جھگڑوں، کبوتر بازی اور غیر ضروری گپ میں اپنا وقت گزارتے تھے لیکن رفیع احمد اپنے والد کے سخت ڈسپلن میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عمر لڑکوں کی عادتیں اختیار نہ کیں۔ وہ دولت مندی کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ سادگی پسند تھے اور پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔

ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کے زیادہ دن ملازمت کے سلسلے میں دوروں میں گزرتے تھے۔ اس لیے رفیع احمد کو ان کے چچا ولایت علی کے پاس بارہ بنکی بھیج دیا گیا۔ چنانچہ وہ دور جو شخصیت کی تعمیر کا زمانہ ہوتا ہے ان کے چچا کے ساتھ گزرا۔ وہ اپنے چچا سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے چچا بارہ بنکی کے ایک بڑے وکیل تھے۔ ان کے خیالات اور اصولوں کا رفیع احمد پر بہت اثر پڑا۔ قوم پرستی کے بارے میں ان کے پرجوش انداز نے بھی رفیع احمد کو خوب متاثر کیا اور ان میں انگریزوں کے خلاف جذبہ پیدا ہو گیا۔

رفیع احمد نے 1913 میں ایم.اے.او. کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ کالج کے ماحول نے ان کے دل میں پوشیدہ قومیت کے خیالات کو اور ترقی دی اور جلد ہی انھیں ایک بے باک انقلابی سمجھا جانے لگا۔ وہ کچھ شرمیلے سے آدمی تھے۔ اس لیے پرجوش تقریریں نہیں کرتے تھے۔

ان کی تنظیمی صلاحیت نے کالج الیکشن کے بارے میں فیصلے لینے میں مدد کی۔ انھوں نے سیاسی تدبیریں سیکھیں۔ کالج کے تجربات نے ان کی سیاسی زندگی میں بہت مدد کی۔ خود کو پیچھے رکھتے ہوئے کام کرنے کا انداز انھوں نے اختیار کیا۔ کالج کے علاقے میں نسبتاً معمولی باغیانہ اختلافات نے ان میں جذبۂ بغاوت کی پرورش کی۔ نیو ایرا اور کامریڈ میں گوپال کرشن گوکھلے اور لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کے مضامین نے انھیں تقویت بخشی۔ قدوائی نے جارج برنارڈ شا، جی کے چیسٹرٹن اور ایچ.جی. ویلس کو بھی بڑی توجہ سے پڑھا۔

دسمبر 1918 میں قدوائی سردیوں کی چھٹی میں بارہ بنکی گئے۔ لکھنؤ میں کانگریس کا ایک بڑا اجلاس ہونے والا تھا۔ مسلم لیگ خلافت کمیٹی کی سفارش پر اس اجلاس میں شریک ہونے والی تھی۔ قدوائی اس امید پر بہت پر جوش تھے کہ وہاں تمام بڑے لیڈروں سے ایک ہی پلیٹ فارم پر ملاقات ہو جائے گی۔

''چچا صاحب! مس بیسنٹ، تلک مہاراج، جناح صاحب، سب وہاں موجود ہوں گے، اس وقت مجھے یہ سنہرا موقع ملے گا کہ میں ان سب کو دیکھوں اور ان کی باتیں سنوں۔ ابا حضور کو اس کے لیے تیار کر دیجیے۔'' قدوائی نے کانگریس کے اس اجلاس میں شرکت کے لیے اجازت کی درخواست کی۔

''ناممکن'' ان کے والد نے جواب دیا۔ جنھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ انھوں نے واضح کرنے کی کوشش کی ''کانگریس ایک انقلابی جماعت ہے۔ حکومت کی نظر میں یہ غلط لوگوں کی جماعت ہے، اگر حکومت کو پتہ چلا کہ تم اس سے متعلق ہو تو مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔''

قدوائی خاموش ہو گئے۔ والد کے فیصلے کے خلاف کچھ کہنا ان کے خیال میں بے ادبی تھی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ اپنے چچا سے بات کرتے رہے۔

''بھائی، یہ نوجوانوں کی خواہش ہے۔ برخوردار اب ماشاء اللہ جوان ہے اور معاملۂ نزاکت کو سمجھتا ہے۔'' چچا نے اوپری دل سے وکالت کی۔ '' وہ کسی بغاوت وغیرہ میں شامل نہیں ہوگا۔ وہ صرف وہاں جانا چاہتا ہے اور فنکشن کو دیکھنا چاہتا ہے۔''

لالہ میاں کے چہرے پر سنجیدگی کی جھریاں پڑ گئیں۔ ''ٹھیک ہے اگر تمھارا اصرار ہے تو......!'' انھوں نے مان لیا لیکن نرمی سے کہا'' میں اسے الزام نہیں دوں گا اگر اس کے آباؤ اجداد کا خون قومیت کے جھکاؤ میں جوش کھانے لگے۔''

لکھنؤ اجلاس ایک متحدہ اعلان اور آپسی میل جول کے ماحول میں ختم ہوا۔ سیاسی طور پر اس میں بھائی چارے اور اتحاد کے ساتھ ایک ذمہ دار قومی حکومت کی مانگ کی جھلک پائی جاتی تھی۔ قدوائی کا جھکاؤ پہلے ہی سے گوپال

کرشن گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی طرف تھا۔ کانگریس کے اجلاس نے انھیں عملی سیاست کی طرف کھینچ لیا۔ بی.اے. کرنے کے بعد انھوں نے قانون کی تعلیم چھوڑ دی اور کانگریس اور خلافت کمیٹی میں شامل ہو گئے۔

1918 میں ان کو ایک تلخ جھٹکا لگا۔ ان کے چچا کا اچانک انتقال ہو گیا۔ قدوائی نے اپنی چچی اور چچازاد بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اطمینان انھیں صرف اپنی نوجوان بیوی مجید النساء کی شکل میں ملا۔ وہ بھی اپنے شوہر کے آباؤ اجداد کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ وہ نرم مزاج تھیں اور انھوں نے بے جھجک مسلم خاتون خانہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس خاندان میں سادہ رہائش اور تہذیبی قدروں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر سے قومیت کے گہرے اثرات اختیار کیے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اپنے شوہر کے پیغام کو پھیلانا ان کا فرض ہے۔ وہ علاقے کی خواتین کے پاس گئیں، انھیں تعلیم دی اور ان سے آزادی اور ستیہ گرہ کی اہمیت بیان کی۔ پھر بھی گھریلو ذمے داریوں کو پورا کرنا انھیں عوامی زندگی سے زیادہ اچھا لگتا تھا، اس لیے کہ اس کے ساتھ انھیں اپنے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کا بھی تھوڑا بہت وقت مل جاتا تھا۔

1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا میں تبدیلیوں اور رولیٹ ایکٹ کے نفاذ کے خلاف احتجاج کے طور پر گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں رولیٹ ایکٹ کے فوراً بعد جلیاں والے باغ کا بھیانک قتل عام 13 اپریل 1919 کو ہوا۔ یہ حادثہ میخائل اوڈائیر کی گورنری میں ہوا تھا۔ سیکڑوں نہتے لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا یا زخمی کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس قوم پرستی کی ایک نشانی یا علامت بن گئی اور ملک کی آزادی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ سمجھی جانے لگی۔

اس سے پہلے نہ کبھی اتنے وسیع پیمانے پر عوامی احتجاج ہوا تھا اور نہ کبھی اتنی بے دردی اور بے رحمی سے اسے کچلا گیا تھا۔ حکومت سے عوام کی بے زاری اور ناراضگی کا اظہار سب سے زیادہ غیر ملکی چیزوں کے بائیکاٹ میں نظر آیا۔

اس موقع پر قدوائی کھل کر سامنے آ گئے اور انھوں نے غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کے لیے رضا کار تیار کیے۔ انھوں نے لوگوں میں سیاسی شعور ابھارنے اور سیاست اور عام زندگی میں عدم تشدد کے پرچار کا کام سنبھالا۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان جو صدیوں سے ساتھ رہے ہیں اور ان کی ان گنت نسلوں نے ملک کی تاریخ میں ساتھ ساتھ حصہ لیا ہے، انھیں آئندہ بھی ساتھ ہی رہنا ہے اور اس لیے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ان طاقتوں کو ناکام بنائیں جو اس برادری اور ایکتا کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اور جب دونوں کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہوگا تو یہ اتحاد بھی لازمی طور پر حاصل کرنا ہوگا۔ چنانچہ یہ فرقہ وارانہ اتحاد اور میل جول کے پیغام کو پھیلانے کے لیے گاؤں گاؤں پیدل پھرے۔ انھوں نے جلسے کیے، احتجاجی مظاہرے منظم کیے مگر جہاں تک ممکن ہو سکا عام پبلک میں تقریر کرنے سے گریز کیا۔

1922 میں قدوائی اپنے بھائی شفیع احمد کے ساتھ گرفتار ہوئے، شفیع احمد نے قومی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس موقع پر قدوائی کو قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ انھیں سیکڑوں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ لکھنؤ جیل میں جواہر لال اور موتی لال نہرو سے ان کے تعلقات بنے۔ ان دونوں کی قدوائی ہمیشہ بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔

دسمبر 1922 میں موتی لال نہرو اور چترنجن داس نے سوراج پارٹی شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی بے اطمینانی کو ہوا دیتے رہنا قومی تحریک کو باقی رکھنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ سوراج پارٹی کی پالیسی بنیادی طور پر بائیکاٹ پروگرام اور پارلیمنٹ میں انگریزوں کی مخالفت کرنا تھی۔

قدوائی سے موتی لال بہت متاثر تھے۔ انھوں نے 1925 میں یو.پی. کانگریس کے جنرل سکریٹریوں کے انتخاب میں قدوائی کو ایک جنرل سکریٹری منتخب کروایا۔ اسی سال چترنجن داس کا انتقال ہو گیا۔ موتی لال نے قدوائی کو ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے الٰہ آباد بھیجا۔

موتی لال نہرو نے قدوائی کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا۔ انھوں نے سوراج پارٹی کے کام کو آگے بڑھایا ... یعنی قانون ساز اسمبلی میں داخلہ ... جس کا مقصد رائے عامہ کو اسمبلی میں پوری قوت سے اٹھانا تھا۔ اپنے صاف ذہن اور خلوص کی وجہ سے قدوائی نے جلد ہی الیکشن کے طریقوں پر قابو حاصل کر لیا۔ اس میدان میں بھی ان کی ذہانت کی بہت تعریف کی گئی۔

جیسے جیسے قدوائی کا سیاسی روپ آگے بڑھا ویسے ویسے ان کے خاندان پر انگریزوں کا غصہ بڑھتا گیا۔ ان کے گھروں کی تلاشی تقریباً روز کا دستور بن گئی اور ان پر بہت جرمانے عائد کیے گئے۔ لالہ میاں کی بے داغ کارکردگی کے باوجود ان سے سختی کے ساتھ جواب طلب کیے جانے لگے اور ان کی دیانت داری پر شبہ کیا جانے لگا۔ رفیع صاحب کے چھوٹے بھائی شفیع احمد کوآپریٹیو سوسائٹی کے نائب رجسٹرار تھے۔ جب سے گاندھی جی کی عام اپیل پر انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا، انگریزی حکومت ان کے والد پر دباؤ ڈالتی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کے کاموں پر کنٹرول کریں۔

لالہ میاں نے مضبوطی کے ساتھ جواب دیا ''نہیں میں اپنے بیٹوں کی زندگی کے طریقوں میں دخل نہیں دوں گا۔''

جب سے رفیع نے یہ سنا تو وہ اور جذباتی ہو گئے، اپنے والد کی اجازت کو خاموشی کے ساتھ قبول کیا اور الیکشن کی تیاری میں ڈوب گئے۔

1925 میں یکا یک وہ دوسرے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کا سات سال کا لڑکا مر گیا۔ اس اکلوتے بچے کی موت نے قدوائی اور ان کی بیوی کو توڑ کر رکھ دیا۔ ان کی پوری زندگی تو اپنے شوہر اور بچے کے گرد ہی گھومتی تھی اور چونکہ قدوائی زیادہ تر سیاسی کاموں میں الجھے رہتے تھے اس لیے اب ان کی توجہ کا مرکز صرف ان کا اکلوتا بچہ رہ گیا تھا۔ قدوائی بھی یہ سب کچھ سمجھتے تھے حالاں کہ ان کا دل خون کے آنسو روتا رہا لیکن وہ صبر و سکون سے خاموش رہے اور اپنی بیوی کی دلدہی کی کوشش کرتے رہے۔

1926 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے الیکشن ہوئے۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود سوراج پارٹی نے 38 جگہیں جیتیں۔ قدوائی اودھ سے چنے گئے۔ انھیں سوراج پارٹی کا چیف مقرر کیا گیا۔ ان کی زبردست سیاسی سوجھ بوجھ اور انسانی رشتوں کو مضبوط رکھنے کی صلاحیت کی وجہ سے کئی اختلافی مسئلوں کے باوجود پارٹی متحد رہی۔ 1929 میں وہ اسمبلی میں سوراج پارٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس پورے عرصے میں موتی لال نہرو سے ان کی وفاداری پوری طرح قائم رہی۔

اس دوران ہندو مسلم جھگڑے نے ملک میں خطرناک شکل اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کہ اسمبلی میں بھی ممبر مذہب کی بنیاد پر بٹ گئے تھے۔ قدوائی نے پارٹی کی تجویز کی ہوئی ترمیموں کی موافقت میں ہندو اور مسلم دونوں فریقوں کے ممبروں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ 1928 کے معاشی بل (فائنانس بل) میں نمک پر ٹیکس لگانے کی تجویز آئی۔ قدوائی نے محسوس کیا کہ یہ غریبوں کے لیے پریشان کن ہوگا۔ انھوں نے ممبروں پر خوب اثر ڈالا اور آخر بل کو نامنظور کرانے میں کامیاب ہوئے۔

1930 میں نمک کا قانون ایک بڑا سیاسی مسئلہ بن گیا۔ اس سے آزادی کی تحریک کو بہت مدد ملی۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کیا۔ کانگریس نے مکمل آزادی کی اپیل جاری کی۔ قدوائی نے جنوری 1930 میں کانگریس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز پر مرکزی اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا اور تحریک میں شریک ہو گئے۔

قدوائی سول نافرمانی کی تحریک کو بھی دیہات تک لے گئے۔ یہاں انھوں نے اسے ''لگان نہیں'' کی شکل دی اپنے دورے کے دوران انھوں نے غریب کسانوں کی حالت کو دیکھا۔

قدوائی کے لیے گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا لیکن پولیس انھیں پہچانتی نہ تھی۔ ان پچھلے برسوں میں وہ کیمرے کی آنکھ سے بچتے رہے تھے اور پہچانے نہ جانے میں خود کو محفوظ پا کر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے اور جلسے کرتے رہے۔ جون 1930 میں جب وہ گرفتار ہوئے تو تحریک ضلع بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

رائے بریلی جیل میں قدوائی صاحب نے قیدیوں کی بدحالی پر احتجاج کیا۔ جب انھیں رسّی بٹنے کا کام دیا گیا تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ لکھنؤ ڈویژن کا انگریز کمشنر والنون، اس مسئلے کو سننے کے لیے آیا۔ اس نے قدوائی صاحب کو مارنے کے لیے چھڑی اٹھائی۔ غصے میں بھرے قدوائی نے ہاتھ بڑھا کر چھڑی چھین لی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ دوسرے دن انھیں قید تنہائی میں بھیج دیا گیا۔

اپنی قید کے زمانے میں انھوں نے تحریک کی رہنمائی اور مجاہدین آزادی کے خاندانوں کی معاشی امداد میں خود کو مصروف رکھا۔ جیسے ہی انھیں پتہ چلتا کہ کسی شخص کو بہت ضرورت ہے تو وہ فوراً اس کی مدد کے لیے راستے تلاش کرنے لگتے۔ ذاتی بھی اور کانگریس فنڈ سے بھی۔

اگست 1934 میں اتفاق سے قدوائی صاحب کی رہائی اور موتی لال نہرو کا انتقال ساتھ ساتھ ہوا اور اسی زمانے میں گنیش شنکر ودیارتھی کانپور میں فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہوئے۔ ان دل ہلا دینے والے غمناک واقعات نے انھیں زبردست صدمہ پہنچایا۔ پھر بھی انھوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

لمبی قید نے قدوائی صاحب کی صحت خراب کر دی تھی۔ انھیں دل کا دورہ پڑا لیکن انھوں نے کام کی رفتار کم نہ کی۔

فروری 1937 کے الیکشن میں کانگریس کو بہت سے صوبوں میں فتح ہوئی اور اس کے نمائندے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یو. پی. میں پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ بنے اور قدوائی کو وزیر بنایا گیا۔ انھیں مالیات اور جیل کے محکمے دیے گئے۔

حکومت بنانے کے بعد کانگریس کو جن مسائل کا سامنا تھا ان میں زمینداری کا معاملہ بہت پرانا تھا۔ یہ ذمہ داری قدوائی کے سر پڑی۔ انھوں نے دیہات کے دوروں کے زمانے میں اس مسئلے کو سمجھا تھا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ ایک مدت سے چلا آ رہا کسانوں اور زمینداروں کے بیچ کا فاصلہ کم کیا جائے اور کسانوں اور زمینداروں کو برابر کا درجہ حاصل ہو۔ ان اصلاحات

سے بیگار (زبردستی بغیر اجرت کی مزدوری) کی بری رسم ختم ہوگئی اور زمیندار کو پیش کیا جانے والا نذرانہ (تحفہ) بھی ختم ہوگیا۔ ان تبدیلیوں سے غریبوں پر خوشگوار اثر پڑا اور قدوائی نے ان کے دل جیت لیے۔

گورکھپور کے سرکاری دورے کے موقع پر قدوائی نے دیکھا کہ مقامی انگریز مجسٹریٹ ان کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ یہ غیر حاضری سوچی سمجھی تھی۔ قدوائی نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ پورے دورے کے دوران انھوں نے اس خودسر انگریز کا کوئی ذکر نہ کیا۔ جیسے ہی دورے سے واپس پہنچے، انھوں نے انگریز مجسٹریٹ کا اپنے سکریٹریٹ میں تبادلہ کرالیا۔ اب اس کے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اب اسے اپنے منسٹر کی تعظیم کرنی ہی تھی۔

ایک دن قدوائی نے اپنے سکریٹری سے رائے بریلی کے جیلر کو بلانے کے لیے کہا۔ جب دونوں کی آنکھیں ملیں تو منسٹر کو یاد آگیا کہ یہ وہی جیلر ہے جس نے قید کے زمانے میں انھیں اذیتیں دی تھیں۔ جیلر نے بھی انھیں پہچان لیا۔

''سر...... سر'' وہ بوکھلا کر ہکلایا۔ وہ اپنے کو خطاوار محسوس کررہا تھا۔

قدوائی نے سمجھ لیا۔ انھوں نے پریشان آفیسر کو پرسکون کیا۔ ''تم اس وقت اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ پریشان نہ ہو۔ میں نے تمھیں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ تم سے بدلا لوں۔'' اپنی خوش اخلاقی سے انھوں نے جیلر کا دل جیت لیا اور وہ ان کا احترام کرنے لگا۔

یو. پی. کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے قدوائی یک جہتی کو قائم رکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ انھوں نے لیڈروں سے بھائی چارہ اور یکجہتی قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنے کی اپیل کی۔ انھوں نے فساد زدہ علاقوں کے دورے کیے۔ فساد سے متاثر لوگوں کی بلا تفریق مذہب امداد کی۔

اس زمانے میں قدوائی کے کچھ مخالفوں نے جو ان کی ہر دلعزیزی سے ناخوش تھے، ان کے خلاف کاناپھوسی کی مہم شروع کی۔ انھوں نے ان کی نیت پر شبہ کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ کسی مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ نہرو ان حالات کو سمجھ گئے۔ چنانچہ انھوں نے اگست 1947 میں انھیں مرکزی کابینہ میں رسل ورسائل (کمیونیکیشن منسٹر) کی حیثیت میں شامل کرلیا۔

اکتوبر 1947 میں قدوائی ایک میٹنگ سے واپس آئے تو ان کا سکریٹری تیزی سے ان کے پاس آیا اور ان کے کان میں کہا۔ ''جناب! ایک بہت ہی بری خبر...... شفیع کو چاقو مار کر ہلاک کردیا گیا۔''

''او۔ نہیں۔ نہیں۔'' قدوائی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ انھوں نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی...... شفیع ان کا اپنا بھائی، جس نے ہمیشہ یک جہتی کے فلسفے کی تعلیم دی۔ جس نے سیکولر خیالات اپنے بزرگوں سے سیکھے اور اپنائے اور ان پر اپنی زندگی اور سیاست میں عمل کیا، وہ اس بے دردی سے فرقہ پرستی کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہ قابل یقین بات نہ تھی۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑے رہے اور آہستہ سے کہا ''انا للہ'' جلد ہی انھوں نے اپنے اوپر قابو پالیا اور گھر میں چلے گئے۔

وہ دہرہ دون کے لیے روانہ ہوئے۔ پورے سفر میں قدوائی خاموش بیٹھے رہے۔ اپنے اندر مردہ بھائی کو دیکھنے کی ہمت پیدا کرتے رہے۔

کافی لوگ منسٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ قدوائی سیدھے بھائی کی لاش پر گئے۔ بھائی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ان کے ماتھے کو پیار کیا اور پھر تھوڑی سی دیر کھڑے رہے اور بس اگلے ہی لمحے وہ وہاں سے ہٹ گئے اور جلد از جلد انھیں دفن کرنے کی ہدایت کی۔

آزادی کے بعد قدوائی کو قانون ساز اسمبلی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ رسل و رسائل کے وزیر کی حیثیت سے وہ خودکفیل ملک کی تعمیر کے حصہ دار بنے۔

جب قدوائی شہر میں ہوتے تھے تو وزیر کی رہائش گاہ پر ملاقاتیوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا تانتا لگا رہتا تھا۔ ہر آدمی، ہر وقت ان تک پہنچ سکتا تھا۔ چاہے وہ ایک طالب علم ہو جو اپنی تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکتا، چاہے کوئی نوجوان ملازمت کی تلاش میں ہو، چاہے کوئی فکرمند ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے مناسب لڑکے کی تلاش میں ہوں۔ سب ان کے پاس سے مطمئن لوٹتے تھے۔ وہ لوگوں کی مالی مدد بھی کرتے تھے اور کیا ہوا وعدہ ہمیشہ نبھاتے تھے۔

ایک بار حصار سے ایک صاحب قدوائی صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اپنی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے رقم کا مطالبہ کیا۔ فوراً ہی انھوں نے انھیں ایک چیک دے دیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو ان کے ایک اچھے دوست پدم کانت مالویہ نے جو اس وقت موجود تھے کہا۔ ''رفیع صاحب۔ بغیر چھان بین کیے آپ نے اسے دو ہزار روپے دے دیے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ...''

قدوائی صاحب نے مسکراتے ہوئے انھیں ٹوکا۔ ''ہاں بھئی یقیناً۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے کوئی لڑکی نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مخالف پارٹی کا آدمی ہے۔ وہ یقیناً کسی ایسی ہی سخت پریشانی میں مبتلا ہوگا، ورنہ وہ میرے پاس مدد کے لیے کبھی نہ آتا۔''!

1951 میں رفیع احمد قدوائی نے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ کی وجہ کانگریس کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے نظریاتی اختلاف تھا۔

اپنے معتقدوں اور پیروکاروں کے ساتھ مل کر قدوائی نے کسان مزدور

پر جا پارٹی، بنائی۔ نتیجے میں اجیت پرشاد جین (نو آبادکاری کے مرکزی وزیر) نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ بال کرشن شرما نوین، نے بھی اپنا استعفیٰ جواہر لال نہرو کو پیش کر دیا۔ نہرو انھیں کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے جین اور نوین کے استعفیٰ بھی منظور نہ کیے تھے۔ اس کی وجہ بھی ان لوگوں کا سیاسی تجربہ اور قابلیت تھی۔ نہرو نے ذاتی بات چیت کے ذریعے مسئلے کو حل کر لیا۔ قدوائی نہرو پر بہت زیادہ اعتماد رکھتے تھے اور انھیں تازہ تازہ آزاد ہوئے ہندوستان کا صحیح رہنما مانتے تھے۔ دوستانہ سمجھ بوجھ اور ملک کی خوشحالی کے پیش نظر اختلافات پگھل کر بہہ گئے۔

کانگریس کو 1952 کے الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ قدوائی لوک سبھا کے لیے بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ الیکشن سے پہلے ملک اب تک کے سب سے بڑے غذائی بحران میں مبتلا تھا۔ ملک میں اناج کی بہت کمی تھی۔

راشن میں بہت بھاری کمی کرنی پڑی۔ اس سے پورے ملک میں احتجاج کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک کے مغربی حصے میں سیلاب اور خشک سالی سے خریف کی فصل تباہ ہوگئی۔ اس سے قحط کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس بحران کے دوران قدوائی نے وزارت خوراک کا چارج سنبھالا۔ نہرو کو یقین تھا کہ قدوائی ان حالات کو ٹھیک کرلیں گے۔

مسلسل دوروں پر رہنے کی وجہ سے قدوائی نے خوراک کی اصلی صورت حال سے پوری واقفیت حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے کسان کے بھیس میں اناج منڈیوں اور گوداموں اور لین دین کا جائزہ لیا۔ ایک معمولی خریدار کی حیثیت سے راشن کی لائنوں میں کھڑے رہے۔ انھوں نے دیکھا کہ راشن بلیک مارکیٹ کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ محکمے کی طرف سے مقرر کردہ قیمتیں اصلی قیمت سے بہت مختلف تھیں۔ لوگوں نے گودام بھر لیے تھے کیونکہ حکومت کی قیمت خرید اور بازار کی قیمتوں میں بہت فرق تھا۔

قدوائی نے محسوس کیا کہ خوراک کی صورت حال حقیقت میں اتنی خراب نہ تھی۔ انھوں نے ایک دم راشننگ ختم کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ اس سے ذخیرہ کرنے والوں نے فوری طور پر اناج بازار میں نکال دیا۔ پیداوار بہت تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے شکر سستی ہوگئی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بازار میں اناج کی کمی نہ رہی۔ اس سے عام آدمی کو بہت سکون ملا۔ ساتھ ہی ساتھ قدوائی نے اناج کے تاجروں پر بھی کڑی نگرانی رکھی کہ وہ مقررہ قیمتوں پر اناج بیچیں۔ کنٹرول ختم ہوا، کھلے بازار میں اناج آیا تو کمی کا ماحول خود بخود خود کفیلی کے معمول میں بدل گیا۔

قدوائی سب سے زیادہ ہر دل عزیز وزیر خوراک بن گئے لیکن ان کی مسلسل مصروفیت نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن کے لیے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن قدوائی نے ان مشوروں کو بھی سنجیدگی سے نہ لیا۔ انھیں ضیق النفس (سانس رکنے) کی شکایت ہوگئی اور وہ ہر وقت کھنکھارتے رہتے تھے۔ وہ اپنے درد کو اپنی خوش مزاجی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔

24 اکتوبر 1954 کو قدوائی کو دہلی میں ایک عام جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ وہ لکھنؤ، کانپور کے دورے سے واپس آئے تھے اور بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ ان کا بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) خطرناک حد تک زیادہ تھا۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ قدوائی مسکراتے ہوئے مان گئے۔ مگر اگلے ہی منٹ وہ کار کی طرف جھپٹے جو ان کے انتظار میں وہاں موجود تھی۔

جب قدوائی ڈائس کی سیڑھی کے قریب پہنچے، ذرا دیر کے لیے رکے، درد سے کراہے۔ اپنے باڈی گارڈ کی مدد سے وہ ڈائس پر پہنچے اور ہاتھ ہلا کر حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ وہ زیادہ دیر نہ بول سکے۔ قدوائی زندہ باد۔ قدوائی زندہ باد کے نعروں کے بیچ وہ ہچکی سے بیٹھ گئے۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے ان کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ وہ اب بہت تکلیف کے ساتھ سانس لے رہے تھے اور پھر انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

رفیع احمد قدوائی کی موت کی خبر سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ چند دن پہلے انھوں نے مذاق میں نہرو سے کہا تھا کہ تم ریٹائر ہو جاؤ۔ قدوائی وزیراعظم ہوگا تو لوگ اپنے پیارے نہرو کو بھی یاد نہ کریں گے۔ جب نہرو کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو انھوں نے قدوائی کا ہر جملہ دہرایا۔ نہرو اس وقت چین میں سرکاری دورے پر تھے۔ انھوں نے سوگواری سے کہا۔'' میں یہ نقصان بہت مشکل سے برداشت کر پاؤں گا۔''

'' ملک نے ایک قابل اور کامیاب وزیر کھو دیا ہے۔ وہ شخص جو بہترین انتظامی صلاحیت رکھتا تھا۔'' صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اظہار تعزیت کیا۔

مسولی کے '' بے تاج بادشاہ'' کو لاکھوں لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ جب وہ اپنے آبائی قصبے مسولی کو لے جائے جا رہے تھے، ہر اسٹیشن پر عقیدت مندوں کی بھیڑ تھی۔ ان کے تابوت کے ساتھ بہت سے دوست گئے تھے۔ لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی، کیشو دیو مالویہ وغیرہ اور بہت سے لیڈر۔ ایک عظیم اور رحم دل انسان کو دائمی آرام کے لیے دفن کر دیا گیا۔

□□□

تحریر: تندنی ست پتھی
ترجمہ: شاغل ادیب

بلی کا مستقبل

بلی ایک ہوشیار لڑکا ہے، کمسن لیکن ذہین، کبھی کبھی وہ بڑوں سا سوچتا ہے۔ وہ ان گنت گیت گا سکتا ہے۔ اسے آج کی تازہ خبروں سے پوری واقفیت ہے، اس نے اپنے بڑوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اسے متعدد انگریزی الفاظ یاد ہیں۔ اس کے والدین سے جو کوئی ملنے آتا اس کی خصوصیات اور خوبیوں کی بیحد تعریف کرتا ہے۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے مدن کی والدہ جو روی بابو کی چچی ہوتی ہے، دسہرہ منانے کے لیے کٹک آئی تھیں اور یہاں ہی مقیم تھیں۔ جب ان کی ملاقات بلی سے ہوئی تو انھوں نے پوچھا— ''پیارے بیٹے کیا تم اسکول جاتے ہو؟'' ''جی ہاں'' بلی نے پورے تیقن سے جواب دیا۔ ''تو آؤ مجھے کمل لوچن کی کوئی چیز سناؤ۔ '' مدن کی والدہ نے کہا— لیکن بلی اس سے بے بہرہ تھا۔ اس کی ماں انیا نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور مدن کی والدہ سے یوں مخاطب ہوئی۔ ''او چچی اسے پرانے گیت قطعی یاد نہیں البتہ نئے گیتوں کا بڑا رسیا ہے یہ۔ اسے انگریزی کے گیت بھی خوب یاد ہیں... '' ''آؤ چچی کو کوئی انگریزی گیت سناؤ بلی— '' اور بلی نے فوراً گانا شرع کر دیا— Ding Dong - Bell Pussy in the Well نہ جانے چچی نے اس کا کیا مطلب لیا لیکن وہ بلی کی تعریف کرتی ہوئی چیخ اٹھیں... ''دیکھو ہمارا چھوٹا بلی... واہ! اس نے ولایتی گیت بہت پہلے ہی سے سیکھ رکھے ہیں۔ اب تو یہ کمسن ہے لیکن بڑا ہو کر واقعی بڑا آدمی بنے گا۔ اور اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ انیا اکثر اپنے شوہر روی بابو سے بلی کے مستقبل کے بارے میں بحث کرتی، وہ کیا بنے گا۔ وہ اپنے بیٹے کو ''آئین اسٹائن'' کی طرح ایک عظیم سائنسداں کی روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔

''مجھے سائنس سے فطری لگاؤ ہے'' وہ کہتی۔ ''لیکن میٹریکولیشن کے بعد میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکی۔ بابا نے شادی جلدی کر دی، لیکن مجھے یقین ہے، میرا بلی ضرور اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک عظیم سائنسداں بنے گا۔ روی بابو کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں، ''واقعی سائنسداں بنے گا۔'' بلی میرا بیٹا ہے اور میں اسے جو چاہوں... ہاں تم تو جانتی ہو کہ میں اسے کیا بناؤں گا... ایک مصنف برناڈ شاہ کی طرح۔ کیا تمھیں ایک مصنف کی خوبیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کمسنی میں کیا بلا کا حافظہ پایا ہے۔'' ''میرے بلی'' خدا بچائے نظر سے انیا غصے سے چیخ اٹھی وہ ایک مصنف بن کر کھائے گا کیا؟ ایک کلرک ہو کر، تم ہمیشہ کلرکی کی طرح سوچتے ہو۔ واقعی ایک مصنف، کیا تاریک مستقبل سوچا ہے تم نے بلی کا؟''

روی بابو خاموش اٹھ جاتے۔ انیا کی غربت و افلاس والی بات سے انھیں بڑا دکھ پہنچتا ہے۔ وہ ایک کلرک ضرور ہیں لیکن انھوں نے اپنے بچے کو کلرک کے بچوں کی طرح تھوڑے ہی پالا تھا۔ انیا انھیں ہمیشہ اسی طرح ان کی غربت کا سہارا لے کر تکلیف پہنچاتی اس کی وجہ ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ ایک بوجھل دل لے کر اٹھ جاتے اور باہر چلے جاتے۔ یہ اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ دونوں بلی کے مستقبل کے بارے میں کبھی متفق نہیں ہوتے تھے۔

انیا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بازار جاتی اور بچوں کے کپڑوں کی دکان سے تازہ ترین اسٹاک اٹھا لاتی جو مختلف نمونوں پر مشتمل ہوتا۔ وہ اپنے بلی کو ہر روز نیا لباس پہناتی اسے اپنے نئے لباس کی عظمت و برتری سے محظوظ ہونے کے لیے برانڈے میں کھڑا کرتی۔ گلی کے گندے بچے بلی کو حسرت اور حسد بھری نگاہوں سے گھورتے۔ کبھی ایک چھوٹا بچہ یہ کہتے ہوئے گزرتا۔ ''آج بلی اپن کے ساتھ نہیں کھیلے گا۔ اس نے نیا کپڑا پہنا والا ہے۔ اس بچے کی آواز میں نشتر بلی کے دل پر گہرا وار کرتا اور وہ خاموش الزام لیے اپنی ماں کی طرف گھوم جاتا۔ اور انیا ان شوخ لڑکوں پر بگڑ کر چلا اٹھتی اور انھیں بھگا دیتی۔ وہ ہر وقت بلی کو سڑکوں کے ان گندے اور بدبودار لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی۔

بلی برانڈے میں کھڑا سڑک پر چیختے چلاتے اور خوش حال لڑکوں کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ ان کے ساتھ مٹی میں لوٹنے کو اس کا جی بہت للچاتا۔ اسے نئے کپڑے پہن کر برانڈے میں ایک کھونٹے کی طرح ٹنگے رہنا قطعی پسند نہیں تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر وہ گلی میں نکل جائے تو اس کی ماں اسے خوب مارے گی۔ ایک دن شام کے کھانے کے بعد بلی نے اپنی ماں سے کہا ''مجھے چپن کی طرح ایک کالی پتلون لا دو۔'' ''کیا۔؟'' بلی کی ماں نے متعجب ہو کر پوچھا، اس پر بلی نے

بڑے اطمینان سے کہا: ''تمھیں تو معلوم ہے کہ یہ کپڑے بہت جلد میلے ہو جائیں گے اگر پتلون کالی ہو تو اس کے میلے ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور میں ان گلی کے بچوں کے ساتھ کھیل سکوں گا۔'' ''کیا؟'' انیا خوفزدہ ہو کر چلا اٹھتی ہے۔ وہ برے بچے ہیں ان کا تعلق غریب اور مفلس گھرانوں سے ہے۔ ان کے ہاں ایک ہی پتلون ہوتی ہے۔ امیر اور کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے ایسا نہیں کرتے۔ وہ گلی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بچوں کی چیخوں سے قیامت بنی ہوئی ہے اور .... آپ کو سدھارنا چاہیے۔ اور ایک اچھا اور صاف ستھرا بچہ بننا چاہیے، وہ بلی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہے،'' ''کیوں''؟ بلی پوچھتا ہے۔ اس پر انیا بھڑک اٹھتی ہے،'' ہم سب تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمھیں بھی ایک اچھا لڑکا بننا چاہیے تم بھی اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھو ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ بہت بڑے۔ بلی خاموش ہو جاتا ہے۔ جیسے اس نے سب کچھ سمجھ لیا ہو۔

انیا اپنے شوہر کے پاس جاتی ہے اور پریشاں ہو کر کہتی ہے۔'' دیکھو اپنا بلی کتنا اچھا بچہ تھا لیکن اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے کہ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے.....''

'' تم اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے کیوں روکتی ہو۔ شاید اُسے اس کا بہت ارمان ہے۔'' روی بابو نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا لیکن یہ بات انیا کے پلے قطعی نہیں پڑی۔'' تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے بلی کو ان گندے ننگے بھوکے، ان پڑھ، جاہل بچوں کے ساتھ کھیلنے دوں۔ کیا تم اسے قلی بنانا چاہتے ہو یا جیب کترا..... یا..... وہ کہتے کہتے اچانک رک جاتی ہے۔ وہ بلی کو سڑک پر کھیلتے دیکھتی ہے اور خوف زدہ ہو کر چیخ اٹھتی ہے..... جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہے۔ بلی خاک و گرد میں لوٹ پوٹ ہے اس کے جسم پر اس کا سیلر سوٹ نہیں بلکہ وہ ایک گندے اور جھریوں والی پتلون پہنے ہوئے ہے۔

انیا اسے پکڑنے کے لیے اٹھتی ہے بلی اسے چکما دیتا ہے اور اپنے باپ کی بانہوں میں چھپ جاتا ہے۔ روی بابو اس کے قمیص سے دھول جھٹکتے ہیں اور پوچھتے ہیں'' تمھارے قمیص کو کیا ہو گیا ہے بابا.....؟'' بلی خوفزدہ ہو کر کہنے لگتا ہے۔'' ممی نے کہا تھا کہ میں اپنے صاف ستھرے کپڑے کے ساتھ سڑک پر کھیل نہیں سکتا اسی لیے میں نے اپنا سیلر سوٹ جن کو پہنا کر کھیلنے کے لیے گلی میں نکل گیا۔ میرے کپڑے تو ہمیشہ کی طرح صاف ستھرے ہی ہیں ادھر آئیے آپ..... وہ دیکھیے جن برانڈے میں بیٹھا ہوا ہے.....''

بلی اپنے باپ روی بابو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اب وہ ان ننگ دھڑنگ بچوں سے بھی زیادہ خوش نظر آتا ہے۔ روی بابو اپنی بیوی انیا کی طرف دیکھتے ہیں اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

مترجم کا پتہ:
304/93, 1-4, Zaib Manzil
Musheerabad, Hyderabad-48

□□□

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں

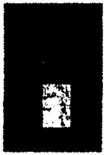

مصنف: ڈی.ڈی.کوسمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی.ڈی.کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات: 319، قیمت -/73 روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

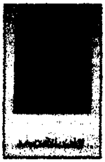

مصنف: کالکارنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ ہی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست و نابود ہو گیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی جنہیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب نسخوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے

صفحات: 704، قیمت -/135 روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یوروپیوں کے سفرناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: 365، قیمت -/90 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 466، قیمت -/109 روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے.اے.نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر.کے.بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بکمنی اور دیگر سلطنتیں اور اس کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 576، قیمت -/114 روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 392، قیمت -/86 روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی.سی.جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 359، قیمت -/75 روپے

انقلاب فرانس

مصنف: جے.ایم.تھامپسن

مترجم: بی.جے.سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 758، قیمت: -/140 روپے

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/09/2006

URDU DUNIYA Monthly, October 2006, Vol. 8, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اول)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولین نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت-/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری
تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" نظم و نثر کے محاسن اور معایب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت-/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت-/152 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

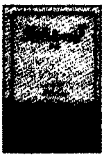

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت-/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کلیات علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں "پرواز"، "نئی دنیا کو سلام"، "خون کی لکیر" اور "امن کا ستارہ" اور دوسری جلد میں "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر"، "لہو پکارتا ہے" اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اول صفحات: 496، قیمت: 164 روپے
جلد دوم صفحات: 533، قیمت: 200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ کلیات حسن نعیم میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت-/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم "کوشش" کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم "ہیپی نس آف اس الون" پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت-/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبا اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ "میرے اپنے" مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم "اپن جن" کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت:-/63 روپے

نوٹ:- طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938